CUC-H00474-1-071657

DASTAVEZ

263/1

2003-2004

VOL-1

A Literary & Research Journal of the Dept. of Urdu, Calcutta University

CHAIRMAN
Prof. Suranjan Das
Pro-V. C. (Academic)

EDITOR
Dr. Shahnaz Nabi
Head, Dept. of Urdu

Publisher : Prof. Ujjwal Basu, Registrar, University of Calcutta
Printer : Nikhat Printing & Packaging, Topsia, Kolkata.

263/1

DASTAVEZ

2003-2004

VOL-1

A Literary & Research Journal of the Dept. of Urdu, Calcutta University

CHAIRMAN
Prof. Suranjan Das
Pro-V. C. (Academic)

EDITOR
Dr. Shahnaz Nabi
Head, Dept. of Urdu

BOARD OF EDITORS
Prof. Abdul Mannan, Prof. Yousuf R. Taqi,
Dr. Shamim Anver, Mr. Gholam Haider Sifat

یادِ رفتگاں

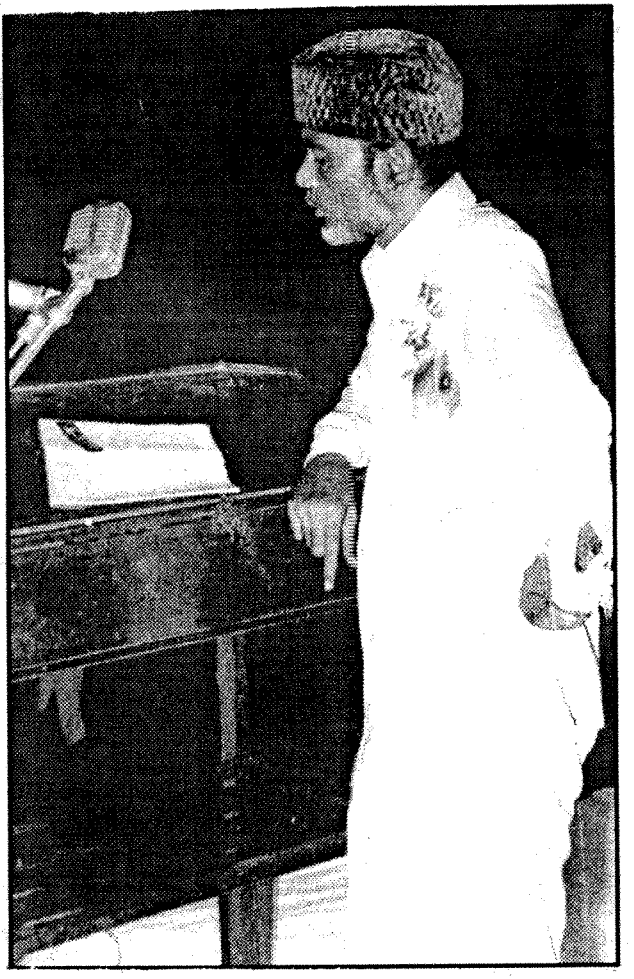

پروفیسر ظفر اُوگانوی

یکم جنوری ۱۹۳۶ء ـــــ ۲۱/جون ۱۹۹۶ء

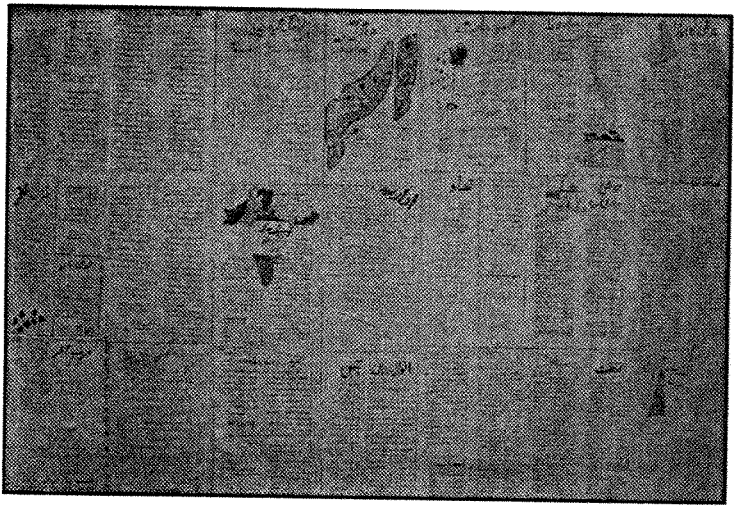

دیوار گیر مجلّہ کی تصویر

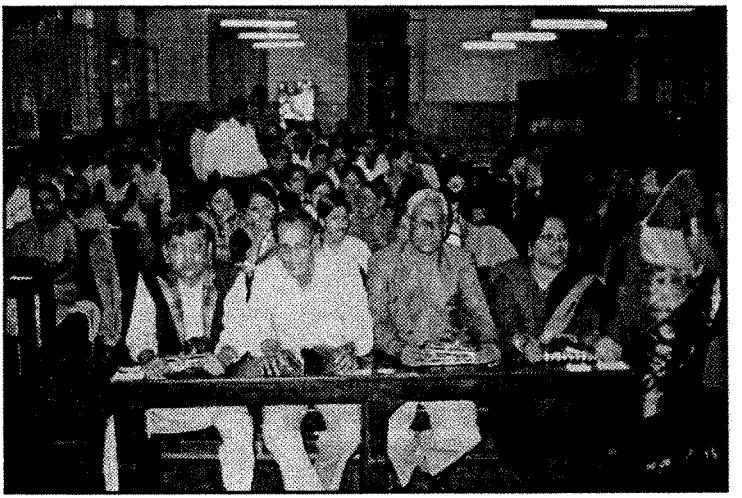

جلسۂ استقبالیہ والوداعیہ کے موقع پر دائیں سے: ڈاکٹر شہناز نبی، پروفیسر یوسف تقی، جناب غلام حیدر اور پروفیسر عبدالمنان

دیوار گیر مجلّہ

ندیم احمد
ریسرچ فیلو، کلکتہ یونی ورسٹی

ملک کی دیگر یونی ورسٹیوں کی طرح ''کلکتہ یونی ورسٹی'' کے مختلف شعبوں کے زیرِ اہتمام دیوار گیر مجلّہ کی اشاعت ایک روایت رہی ہے۔ یونی ورسٹی کا اُردو شعبہ دیوار گیر مجلّہ شائع کر کے اس روایت کو مستحکم کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس دفعہ بھی گزشتہ سال کی طرح شعبۂ اُردو کا دیوار گیر مجلّہ ایک نئی آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ مجلّہ کی رُونمائی ڈاکٹر شہناز نبی (صدر، شعبۂ اُردو) نے کی۔ مجلّہ میں موجود طلبا و طالبات کی تخلیقات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ان تخلیقات کے پس منظر میں جو ذہن کام کر رہا ہے' اس میں نئی منزلوں کی تلاش اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

نثری اور منظوم تخلیقات کے علاوہ طلبا و طالبات نے تصویروں کے ذریعہ بھی فنونِ لطیفہ میں پیش کیے جانے والے خیالات' محسوسات اور سوالات کی تجسیم کی نہایت ہی کامیاب کوشش کی ہے۔ دیوار گیر مجلّہ میں شائع شدہ متن اور تصویروں کی شکل میں مجسم خیالات جہاں ان کے مطالعے کی وسعت اور بے لگام تخئیل کی چغلی کرتے ہیں' وہیں اس بات پر بھی دال ہیں :

کتنے اصنام نا تراشیدہ
پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں

اگر ان طلبا و طالبات نے اپنے اساتذہ کے ''علمی مشوروں'' کو خضرِ راہ جانا اور تخلیقی سفر میں بے راہ روی کے شکار نہ ہوئے تو مستقبل میں کوئی بڑا نام بھی سامنے آسکتا ہے' ایسا کہ جس پر نہ صرف شعبۂ اُردو بلکہ پوری کلکتہ یونی ورسٹی ناز کر سکے۔

☆☆☆☆☆

وَن ڈِے ٹُور

ہر سال کی طرح امسال بھی وَن ڈِے ٹُور کا اہتمام کیا گیا۔ اساتذہ کی رہنمائی میں طلباء و طالبات نے کلیانی کا سفر کیا جو ضلع ندیا میں واقع ہے' جہاں مغربی بنگال کی اہم یونی ورسٹیوں میں سے ایک ''کلیانی یونی ورسٹی'' واقع ہے۔ اس ٹُور میں ایم-اے سالِ اوّل و دوم کے طلباء و طالبات کے علاوہ ریسرچ اِسٹوڈنٹس بھی شامل تھے۔

☆☆☆☆☆

ون ڈے ٹُور کا ایک منظر

(اسٹیج پر بائیں سے) جناب غلام حیدر، ڈاکٹر شمیم انور، ڈاکٹر شہناز نبی، پروفیسر یوسف تقی اور پروفیسر عبدالمنان
(مائیک پر) ایم اے فرسٹ ایئر کی ایک طالبہ غزل پیش کرتے ہوئے

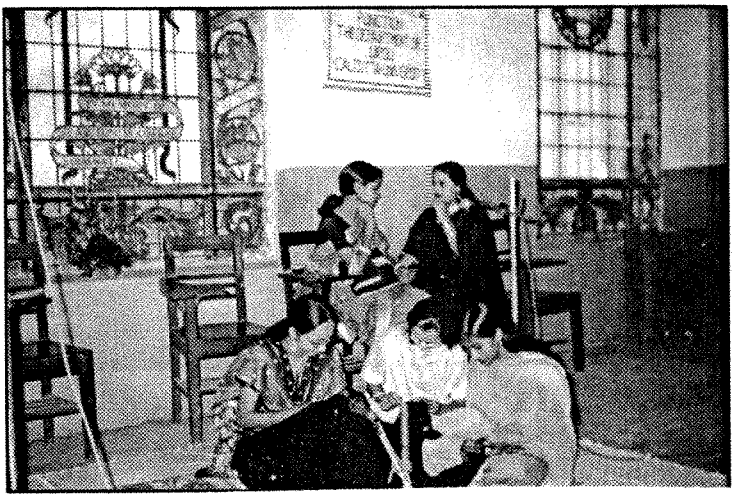

ایم اے (سال اول و دوم) کی طالبات منشی پریم چند کے افسانے پر مبنی ڈراما ''دو بہنیں'' پیش کرتے ہوئے

شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی وَرسٹی کا استقبالیہ والوداعیہ جلسہ

گزشتہ ۲۲ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو کلکتہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں جلسۂ استقبالیہ والوداعیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں سال اوّل ۲۰۰۳ء کے طلبا و طالبات کو استقبالیہ دیا گیا اور سال دوئم ۲۰۰۳ء کے سابق طلبا و طالبات کو الوداعیہ دیا گیا۔ تقریب کا آغاز تلاوت قرآن اور نعت شریف سے ہوا۔ اساتذہ کرام کی گُل پوشی کی گئی اور تمام اساتذہ نے تقریب کی مناسبت سے اپنے خیالات پیش کیے۔ بعد ازاں طلبا و طالبات نے غزل، نظم، لطیفے پیش کیے اور آخر میں منشی پریم چند کے افسانہ ''دو بہنیں'' کو ڈراما کی شکل میں پیش کیا گیا۔ ڈراما کی مکالمہ نگاری اور ہدایت کاری محمد فاروق اعظم نے دی۔ اس تقریب کی صدارت صدر شعبۂ اُردو محترمہ ڈاکٹر شہناز نبی نے کی اور نقابت کے فرائض محمد فاروق اعظم اور سعدیہ قاضی نے انجام دیئے۔ اس تقریب کے رُوحِ رواں محمد فاروق اعظم، زبیر عالم، مختار احمد، رحمتی خاتون، سعدیہ قاضی، حما خالد اور سالِ دوئم ۲۰۰۳ء کے بھی طلبا و طالبات تھے۔

(رپورٹ : محمد فاروق اعظم)

شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی کی تقریب استقبالیہ والوداعیہ میں صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر شہناز نبی صدارتی خطبہ دیتے ہوئے۔

۱۔ **شبنم پروین** JRF

تحقیق کا موضوع : ''اُردو ناولوں میں مارکسزم کے اثرات''

نگراں : پروفیسر یوسف تقی

۱۔ **فرزانہ شاہین** JRF

تحقیق کا موضوع : ''خواتین کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل''

نگراں : ڈاکٹر شہناز نبی

درج ذیل طالب علم کو یونی ورسٹی ریسرچ فیلوشپ عطا ہوئی :

۱۔ **ندیم احمد**

تحقیق کا موضوع : ''محمد حسن عسکری-حیات وخدمات''

نگراں : ڈاکٹر شہناز نبی

☆☆☆☆

وضائف

سال ۰۳-۲۰۰۲ء میں درج ذیل طلبا و طالبات کو فری شپ سے نوازا گیا :

ایم -اے (سال اوّل)

شاہجہاں خاتون، نیاز احمد، سیّد قمر صدیقی، فاروق اعظم (فل فری)

رضیہ خاتون، شوکت جہاں، مہہ جبیں حق، افشاں شبنم (ہاف فری)

ایم-اے (سال دوم)

شاکرہ خاتون، رافع غزالہ، محمد شاہد، منورہ بختیار، آفتاب عالم (فل فری)

رُوحی سعید، نصرت سلطانہ، شہانی بیگم (ہاف فری)

مغربی بنگال اُردو اکاڈمی نے ایم-اے اُردو کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر پانے والوں کو مبلغ ۱۰۰۰ روپے کے انعام اور سند سے نوازا۔

حنا خالد - (۰۲-۲۰۰۰ء) ارشد علی - (۰۳-۲۰۰۱ء)

درج ذیل طلبا و طالبات یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے ذریعہ منعقد JRF کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے۔

شعبۂ اُردو کی سرگرمیاں

پی ایچ-ڈی میں نئے داخلے

(05. 11. 2003 تا 18. 02. 2003)

ریسرچ اسٹوڈنٹ	موضوع	نگراں
۱۔ شفیع الرحمٰن	شاہ مقبول احمد-حیات وخدمات	پروفیسر یوسف تقی
۲۔ فرزانہ شاہین	خواتین کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل	ڈاکٹر شہناز نبی
۳۔ سلمیٰ کبریٰ	اُردو رباعی میں تصوّف کی روایت	پروفیسر عبدالمنان
۴۔ محمد صابر رضا	علامہ اثر ردولوی: حیات، خدمات اور دیوان کی تدوین	ڈاکٹر شمیم انور
۵۔ نعیم احمد	جیلانی بانو-حیات وخدمات	ڈاکٹر شہناز نبی
۶۔ جاوید اختر	واجد علی شاہ کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر شمیم انور
۷۔ فریدہ انور	مغربی بنگال میں اُردو صحافت	ڈاکٹر شمیم انور
۸۔ شہزادی عالم آرا	پروفیسر عباس علی خاں بیخود: حیات اور کارنامے	ڈاکٹر شمیم انور
۹۔ ریحانہ خاتون	مغربی بنگال میں اُردو فکشن	پروفیسر یوسف تقی
۱۰۔ شبنم بانو	اُردو فکشن پر جدیدیت کے اثرات	پروفیسر یوسف تقی
۱۱۔ انجم آرا	آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اُردو نثر	پروفیسر یوسف تقی
۱۲۔ صابر حسین	جاوید نہال-حیات وخدمات	پروفیسر یوسف تقی
۱۳۔ نشاط آفریں	اُردو افسانوں میں عورتوں کے سماجی واقتصادی حالات	پروفیسر یوسف تقی
۱۴۔ محمود ریاض	کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کا تقابلی مطالعہ	پروفیسر عبدالمنان
۱۵۔ ندیم احمد	محمد حسن عسکری-حیات وخدمات	ڈاکٹر شہناز نبی
۱۶۔ محمد فہیم اللہ	غیاث احمد گدی-حیات وخدمات	ڈاکٹر شمیم انور
۱۷۔ عاصم شہنواز شبلی	اُردو غزل میں شہر کا تصور	پروفیسر عبدالمنان

References :

1. Shakespeare Manual, By F. G. Fleay
   Macmillan & Co., London-1878

2. The Indian Theatre, By R. K. Yajnik, Great Britain, 1933

3. Urdu Theatre (Vol-I), By Abdul Aleem Nami,
   Anjuman Tarraqqi Urdu, Karachi-1966

4. Influence of English Literature on Urdu Literature
   By Abdul Latif, London-1924.

5. Aagha Hashr Kashmiri Aur Urdu Drama, By Anjuman Ara Anjum
   Educational Book House, Aligarh-1979

☆☆☆☆

مزید تین ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ لالہ سیتارام کا ''کنگ لیئر'' عنایت اللہ کا ''شاہ لی ار'' اور غنی بدایونی کا ''سفید خون''۔

سمبیلائن : اس ڈرامے کو ہندستان میں کافی شہرت ملی۔ اس ڈراما کے سنہ تصنیف میں اختلاف نظر آتا ہے۔ چالمرس کے مطابق 1606 ہے اور میلون نے 1609 قرار دیا۔ بہر کیف Fleay کے مطابق اس ڈرامے کا پلاٹ بکاسیو کے ایک ناول پر مبنی ہے۔

اُردو میں اس کے کئی ترجمے موجود ہیں۔ یاجنک نے تین ترجموں کے بارے میں لکھا ہے۔ ''ظلم ناروا'' (1899) دوسرا ''میٹھا زہر'' (مصطفیٰ سیّد علی 1909) اور تیسرا ''سمبیلائن'' (عبدالعزیز 1902)۔ ڈاکٹر نامی نے ایک نام کا اور اضافہ کیا ہے۔ ''فریبِ محبت'' جسے پنڈت بیتاب دہلوی نے ترجمہ کیا۔

اینٹونیو اینڈ کلوپٹرا : شیکسپیئر نے اس ڈرامے کو 1608 میں مکمل کیا۔ Fleay لکھتے ہیں کہ ''یہ ڈراما Plutarch's "Life of Marcus Anotonius" کی تخلیق پر مبنی ہے۔ اُردو میں اس کے کئی ترجمے کیے گئے ہیں۔ یاجنک نے دو ترجموں کے بارے میں لکھا ہے۔ ایک ''کالی ناگن'' (جوزف ڈیوڈ 1906) اور دوسرا ''زن مرید'' (1909) ڈاکٹر نامی نے مزید دو ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ شکوہ آبادی کا ''کرشمہ شباب'' عرف ''مارِ آستین'' اور عنایت اللہ دہلوی کا ''انطونی قلوپطرہ'' لیکن ہندستان میں اسے زیادہ مقبولیت نہیں ملی۔

الغرض شیکسپیئر کو جہاں انگریزی میں پڑھنا ایک الگ قسم کا لطف عطا کرتا ہے، وہاں ان کے تراجم کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی کچھ کم انبساط کا باعث نہیں۔ اُردو میں آغا حشر نے شیکسپیئر کے ڈراموں کو ہندستانی ماحول میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی کی۔ شیکسپیئر ہی کی طرح مکالموں کو برجستہ اشعار سے سجایا جو کبھی طبع زاد ہوا کرتے تھے اور کبھی کسی دوسرے شاعر کی کاوشوں کا نتیجہ۔ اس طرح شیکسپیئر کو شیکسپیئر کے رنگ میں پیش کرنے کی جو کوشش اُردو ڈراما نگاروں کے یہاں ملتی ہے، وہ لائقِ تحسین ہے۔

☆☆☆☆

کیا ہے۔ ''اوتھیلو عرف چغل خور آئینہ'' (مترجم سجاد حسین جوہر بنارسی) اور دوسرا ''وہمی جنگ'' (نازاں دہلوی)

میکبیتھ : بغیر کسی اختلاف کے یہ ڈرامہ 1606 میں مکمل ہوا۔ اس ڈرامے کو لکھنے کا جذبہ ان کے دل میں ہالین شیڈ کے "Chronicle" اور "Discovery of Witch Craft" نے پیدا کیا۔ F. G. Fleay لکھتے ہیں :

"Founded on Holinshed's chronicle, and Regin old scot's Discovery of witchcraft."

اُردو میں اس کے کئی ترجمے اور تصرّف دستیاب ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر پروفیسر یاجنک لکھتے ہیں کہ: ''میکبیتھ کا کوئی ترجمہ اُردو میں نہیں'' یاجنک کی اس رائے سے کوئی بھی اتفاق نہیں کرتا۔ انجمن آرا انجم لکھتی ہیں :

''یاجنک کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اُردو میں میکبیتھ کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ آغا حشر نے ''خوابِ ہستی'' کا پلاٹ اسی ڈرامے سے اخذ کیا ہے جبکہ ڈاکٹر نامی نے دو ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ پہلا ترجمہ پسٹن جی نے ''تلاطمِ ایران'' کے نام سے کیا۔ دوسرا ترجمہ عنایت اللہ نے ''میکبیتھ'' کے نام سے ہی کیا۔

کنگ لیئر : اس ڈرامے سے شیکسپیئر کے Observation اور تحقیقی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اس ڈرامے کو رقم کرنے سے پہلے تاریخی واقعات کا گہرا مطالعہ کیا اور خاص طور پر Holinshed's Chronicle سے فیضیاب ہوئے جبکہ اس ڈرامے میں "Blind King of Paphlogonia" کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ Fleay لکھتے ہیں :

"The episode of Gloster and his sons is taken from the story of the Blind King of Paphlogonia."

اس کی سنہ تصنیف بغیر کسی اختلاف کے 1606 ہے۔

پروفیسر یاجنک کے مطابق اس کے دو ترجمے کیے گئے۔ پہلا ''ہار جیت'' کے نام سے منشی مراد علی نے 1905 میں کیا۔ دوسرا آغا حشر نے 1906 میں ''سفید خون'' کے نام سے کیا۔ ڈاکٹر نامی نے

جولیس سیزر اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ بالکل طبع زاد ڈراما ہے۔ اس کی سنہ تصنیف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ میلون کے مطابق یہ ڈراما 1607 میں تصنیف کیا گیا ہے جبکہ ڈلیس نے 1604 لکھا ہے کیونکہ یہ ایک سیاسی ڈراما ہے اور ایسی سیاست جس کا تعلق ہندستانی سماج اور معاشرہ سے نہیں ہے، اس لیے اس کے ترجمے زیادہ نہیں ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نامی کے مطابق صرف سیّد تفضّل حسین نے ''جولیس سیزر'' کے نام سے ہی ترجمہ کیا۔

ہیملیٹ : یہ ایک ایسا ڈراما ہے جسے ہندستان میں بہت زیادہ کامیابی ملی اور ایسی کامیابی جو شیکسپیئر کے دوسرے ڈراموں کو نصیب نہیں ہوئی۔ انجمن آرا انجم بھی اس سے اتفاق کرتی ہیں۔ ''مشرقی ہندستان میں اُردو اسٹیج پر اس کا خوب بول بالا رہا۔'' اس ڈرامے کو لکھنے کا جذبہ شیکسپیئر کے دل میں "Sako Grammaticus" کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ Fleay اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "He took it from Sako Grammaticus."

اُردو میں اس کے کئی ترجمے کیے گئے۔ بقول انجمن آرا انجم اس کا پہلا ترجمہ منشی مہدی حسن نے ''خون ناحق'' کے نام سے 1895 میں کیا۔ امراؤ لکھنوی نے 1895 میں ''جہانگیر'' کے نام سے 1902 میں افضل خان نے ''ہیملیٹ'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ انہوں نے عنایت اللہ خان اور نظیر بیگ کا بھی ذکر کیا ہے۔

اوتھیلو : شیکسپیئر نے اس ڈرامے کو 1604 میں مکمل کیا اور اس کا پلاٹ Giraldi کے ایک ناول پر مبنی ہے۔ Fleay اس بات کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"Founded on a novel by Giraldi Cinthio."

شیکسپیئر کا یہ ڈراما حزینہ کی سب سے بہترین مثال ہے۔ ہندستان کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے اور آج بھی یہ کسی نہ کسی زبان میں اسٹیج ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو میں بھی اس کے کئی تراجم اور تصرّف ہیں۔ سب سے پہلے پروفیسر یا جنک نے چار ترجموں کا نام پیش کیا ہے۔ ''شہید وفا'' (منشی مہدی حسن 1898)، ''شیر دل'' (نظر دہلوی 1918)، ''جعفر'' (احمد حسین خان 1895) اور ''اوتھیلو'' (گوپال گوئل 1911) ڈاکٹر نامی نے اس فہرست میں مزید دو ناموں کا اضافہ

اُردو میں اس کے بہت سارے ترجمے کیے گئے۔ان ترجموں سے ہی ہم ہندستان میں اس کی مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔سب سے پہلے ڈاکٹر یاجنک نے چار ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ پہلا ترجمہ ''بزم فانی'' (مہر حسن 1897) دوسرا ترجمہ ''گلنار فیروز'' (مہدی حسن 1902)، تیسرا ترجمہ، فیروز لقا وگلنار سیر (نظیر بیگ 1905) اور چوتھا ترجمہ ''گل سازی فیروز'' (1908 جی ایل سیٹھ) ہے جبکہ ڈاکٹر نامی نے اس فہرست میں کئی اور ناموں کا اضافہ کیا۔ان کے مطابق ''عشق فیروز لقا عرف گلنار سیر'' کے نام سے نظیر بیگ نے ترجمہ کیا۔احسن لکھنوی نے ''بزمِ فانی عرف گلنار'' جی ایل سیٹھی گلنار فیروز (1909) جوالا پرشاد برق نے ''معشوق فرنگ عرف گلنار فیروز'' (1896)، غنی بدایونی نے ''بزمِ فانی عرف دھوکہ دھڑی'' کے نام سے ترجمہ کیا۔

مرچنٹ آف وینس : یہ نسلی تعصب پر ایک شاہکار ڈراما ہے۔اس میں شیکسپیئر نے پائتا گروس کا یہ نظریہ کہ ''انسان میں جانور رہتا ہے'' کو بڑی خوبی سے ثابت کیا ہے۔تاہم اسے ہم موصوف کا بالکل طبع زاد ڈراما نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا پلاٹ Giovanni کا مشہور ناول "Gianetta" سے لیا گیا ہے۔Fleay اس راز کو فاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"The mainpoint is from the Pecorone of Giovanni Fiorentino's first Novel Gianetta."

شیکسپیئر نے اس کا پلاٹ کہیں سے بھی اخذ کیا ہو لیکن اُردو والوں نے اس کے پلاٹ پر کئی ڈرامے تیار کیے اور بہت سارے ترجمے کیے گئے۔ڈاکٹر نامی نے پانچ ترجموں کی فہرست پیش کی ہے۔''دل فروش'' (احسن لکھنوی 1900)، ''چاند شاہ سود خور'' (1895)، ''تاجر وینس'' (نذر محمد فتح علی 1884)، مرچنٹ آف وینس (بالیشور پرشاد) اور ''دل فروش عرف یہودی سوداگر'' (افسون شاہ جہاں پوری)، ڈاکٹر یاجنک نے اس کا ایک ترجمہ آغا حشر کے نام سے بھی منسوب کیا ہے مگر کوئی واضح ثبوت پیش نہیں کر سکے۔راقم الحروف نے ''مٹھی بھر گوشت'' کے نام سے پہلی مرتبہ اس ڈرامے کا تصرف 28 دسمبر 1998 میں کلا مندر میں اسٹیج کیا۔اس کے بعد اس کے کئی شوز ہوئے۔

جولیس سیزر : شیکسپیئر کے ڈراموں کا ایک اہم موضوع سیاست رہا ہے اور

کیا۔حتیٰ کہ اس پر ''انگور'' نام کی ایک ہندی فلم بھی بنائی گئی۔

میڈ سمر نائٹ ڈریم : یہ ایسا ڈراما ہے جسے آج بھی فوک ڈرامے کی شکل میں اسٹیج کیا جارہا ہے۔اس کی سنہ تصنیف بقول میلون اور ڈلیس 1594 ہے مگر Fleay کا خیال ہے کہ اسے 1592 میں لکھا گیا۔اس ڈرامے کے کئی اہم حصوں کو شیکسپیئر نے چاؤسر کے "Knights Tale" سے اخذ کیا ہے۔F. G. Fleay رقم طراز ہیں :

"Hints for the frame work of Theseus and Hippolyta were probably received from Chaucer's "Knights Tale."

لیکن اس ڈرامے کو دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں پیش کیا گیا۔حبیب تنویر نے 90 کی دہائی میں اسے ''کام دیو کا اپنا ریتو بسنت کا سپنا'' کے نام سے کئی مرتبہ اسٹیج کیا جب کہ جے این کوشل نے اسے ''آدھی رات کا سپنا'' کے نام سے ترجمہ کیا اور N. S. D. کے بینر تلے بنی وَس نے اسے 1982 میں اسٹیج کیا۔تاہم اس سے پہلے کئی ترجمے کیے گئے۔ڈاکٹر یاجنک کے مطابق 1903 میں پہلی بار محمد اظہر نے ''جامِ اُلفت'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ڈاکٹر نامی نے تین ترجموں کا ذکر کیا ہے۔امیر احمد علوی نے 1900 میں اسے ''خوابِ پریشاں'' بنا دیا۔1900 میں احسن لکھنوی نے بھی ترجمہ کیا لیکن اس کے عنوان کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔پھر 1902 میں محمد اطہر علی آزاد نے ''جام اُلفت'' کے نام سے ترجمہ کیا۔

رومیو اینڈ جولیٹ : یہ ڈراما دنیا کا ایک بہترین عشقیہ ڈراما ہے۔دراصل دنیا کی بیشتر عشقیہ تخلیقات کے جز اسی ڈرامے سے حاصل کیے گئے ہیں مگر شیکسپیئر نے اس ڈرامے کا جز پورٹو کے ناول اور بیسٹو کی پینٹنگ سے حاصل کی ہے۔Fleay لکھتے ہیں :

"Parto's Novel, Hystaria Di Dui Nobili Amanti, followed by Bandello's Novel was the origin of Boisteau from Bointeau painter took his Romeo and Julietta ..... Shakespeare copied the poem, using the novel."

یہ ڈراما بقول میلون 1596 میں رقم کیا گیا۔

سے پہلے 1796 میں "Hamlet" اور "Henry VIII" کے کئی مناظر کا ترجمہ کر کے اپنی کتاب ''ہندستانی زبان کے قواعد'' میں شامل کیا۔ جاوید نہال، عتیق صدیقی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> ''اس نے ہندستانی زبان کے قواعد میں شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے تراجم بھی شامل کیے ہیں۔ عتیق صدیقی صاحب نے گل کرسٹ کے اس اہم کام کو ادبی کارنامہ قرار دیا ہے۔''

لیکن شیکسپیئر کے ترجمے اور ماخوذ کا اصل سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب پارسی تھیٹر کا دور آیا۔ اس دور میں ڈرامے کا مقصد محض تجارتی تھا۔ تھیٹریکل کمپنیاں زیادہ سے زیادہ روپے کمانے کی کوشش کرتے اور شیکسپیئر کا ڈراما ایک ایسا مکمل ڈراما تھا جس میں ہر طرح کے عنصر موجود تھے۔ اس لیے ان کے تمام ڈراموں کو اُردو کا جامہ پہنایا گیا۔ ذیل میں ان کے اہم ڈراموں کا ذکر کیا جا رہا ہے:

کامیڈی آف ایررز : شیکسپیئر کے اس ڈرامے نے دنیا کو مکمل طربیہ کا ایک صحت بخش تصور دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی طربیہ ڈرامے تخلیق کیے گئے مگر ان کا معیار پہلا یک بابی ڈراما ''بندر کا پنجہ'' سے آگے نہ بڑھ سکا۔ آج Farce سے لے کر Slapstick Comedy تک کے تمام سرے اسی ڈرامے سے جا کر ملتے ہیں۔

شیکسپیئر نے یہ ڈراما بقول میلون 1592 میں لکھا جبکہ ڈریک کا خیال ہے کہ اس کا سالِ تصنیف 1591 ہے۔ موصوف نے اس ڈرامے کی کہانی کسی حد تک Plautes کی تخلیق "Manachemi" سے حاصل کی ہے۔ F. G. Fleay لکھتے ہیں :

"Taken from the 'Manachimi' of Plautes in great part of the plot."

بہر کیف ان کی اس کامیڈی نے ہر ملک، قوم، ذات اور نسل کے لوگوں کو ہنسایا اور اُردو والوں نے بھی اسے اپنے اسٹیج کی زینت بنانے کے لیے اس کے کئی ترجمے کیے۔ ڈاکٹر یاجنک نے اپنی کتاب ''دی انڈین تھیٹر'' میں دو ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ ''بھول بھلیاں'' کے نام سے فیروز شاہ خان نے 1896 میں اور عبدالکریم نے 1913 میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر نامی نے مزید دو ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ 1912 میں نارائن بیتاب اور 1906 میں احسن لکھنوی نے ''گورکھ دھندا'' کے نام سے پیش

اور صرف شاعری اور تنقید پر ہی نہیں بلکہ اُردو ڈراما پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ کیونکہ جس طرح اُردو شاعری' اُردو ادب کی پہچان ہے' اسی طرح ڈراما انگریزی ادب کی جان ہے۔ اس لیے انگریزوں نے ملک میں اپنی حکومت کے ساتھ ساتھ ڈرامے کو بھی فروغ دینا شروع کیا۔ مختلف تھیٹریکل کمپنیاں قائم کی گئیں۔ پہلے پہل مذہبی تبلیغ کی غرض سے ڈرامے کیے گئے' پھر شیکسپیئر کے ڈراموں کے مناظر اسٹیج کیے جانے لگے۔ انگریزوں کی اس کوشش نے لوگوں کے دلوں میں دبی ہوئی چنگاری کو پھر سے سلگا دیا اور اسی دوران عمل کی چار دیواری میں اُردو ڈرامے کا جنم ہوا۔ لہٰذا اُردو ڈرامے کے اس ننھے پودے پر مغربی ڈرامے کی تیز دھوپ کا گہرا اثر پڑنا فطری تھا۔ انجمن آرا انجم اپنی کتاب ''اُردو ڈراما اور آغا حشر'' میں لکھتی ہیں :

> ''انگریز اپنے ساتھ ساتھ انتہائی ترقی یافتہ شکل میں جو ادبی صنف لائے' وہ ڈراما تھی۔ اُردو ادب میں چونکہ ڈرامے کا آغاز ہی ہوا تھا' اس لیے یہ فطری بات تھی کہ اُردو ڈرامے پر انگریزی ڈرامے کا بہت اثر پڑا۔''

مغربی ڈراموں کے تراجم اور تصرّف کی ایک لمبی فہرست اُردو ڈراما میں موجود ہے لیکن ترجمے کے مقابلے میں تصرّف زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ترجمہ کا فن ایک کٹھن فن ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کے ڈراما نگار مکمل طور پر انگریزی زبان سے واقف نہیں تھے۔ وہ ایک ڈراما میں تفریح کے عناصر تلاش کرتے اور اسے ہندستانی تہذیب و معاشرت کے مطابق اسٹیج پر پیش کرتے اور کبھی کبھی ہندستانی تہذیب کا لبادہ اس سلیقے سے اُڑھاتے کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی انگریزی ڈرامے کا چربہ ہے۔ انجمن آرا انجم لکھتی ہیں :

> ''اپنے ملک کا ذہنی پس منظر اُردو ڈراموں میں اس طرح پیش کیا گیا کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ مانگے کا اُجالا ہے۔''

یوں تو بہت سے مغربی ڈراما نگاروں کے ڈرامے ترجمے کیے گئے مگر لوگوں کی نظر سب سے زیادہ شیکسپیئر پر رہی اور تقریباً ڈراما نگاروں نے ان پر ہاتھ صاف کیے۔

اُردو میں شیکسپیئر کے ترجمے کی روایت شروع کرنے والے جان گلکرسٹ تھے۔ انہوں نے سب

شیکسپیئر کا یہ سورج صرف انگلستان میں ہی نہیں بلکہ ہر ملک و ادب میں ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ کیوں کہ وہ کسی ایک مخصوص مٹی، ملک یا قوم کے فن کار نہیں تھے۔ اس لیے انہیں سرحد کی لکیروں میں محدود کرنا صرف ان پر ہی نہیں بلکہ پوری کائنات پر ظلم ہوگا۔ مشہور نقاد Landor (لینڈر) لکھتے ہیں : "Not our Poet, but the worlds"

دنیا میں شیکسپیئر ہی ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور آج بھی ان پر تخلیقات کا سلسلہ جاری ہے اور ہر تحقیق ایک نیا پہلو اُجاگر کرتا ہے۔ ہر مشاہدہ ایک نئے نقطے کو ثابت کرتا ہے لیکن پھر بھی اب تک ان کی مکمل گہرائی کا اندازہ کسی دانا کو نہیں ہو سکا کیوں کہ ان کی ہر تہہ میں موتیوں کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے اور یہی چیز ادیبوں کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ وہ شیکسپیئر کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پوری دنیا میں ہم ایسے کسی ادب کا تصور نہیں کر سکتے جس میں شیکسپیئر کے تراجم دستیاب نہ ہوں۔ تو پھر ظاہر ہے اُردو زبان اس نیک عمل میں کیسے پیچھے رہ جاتی۔

جب گوروں نے سات سمندر کا سفر طے کر کے ہندستان میں اپنی ہٹ دھرمی شروع کی تو ہر طرف تباہی مچ گئی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسی قوم نے اس ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا لیکن ساتھ ہی ساتھ مٹھی بھر فائدے بھی حاصل ہوئے۔ تاہم ان کی نیت فائدہ پہنچانے کی نہیں تھی۔ بہر کیف اس معاملے میں سب سے زیادہ خوش نصیب اُردو زبان و ادب رہا۔ اس سلسلے میں سیّد عبداللطیف اپنی کتاب "Influence of English Literature on Urdu Literature" میں لکھتے ہیں :

> ''انگریزی زبان و ادب کا زبردست خزانہ جو مغربی زندگی اور تہذیب کے صحت مند عناصر کا آئینہ دار تھا، ہندوستانیوں کے ہاتھ آیا۔ یہ اثرات ہندستان گیر تھے اور چونکہ اُردو ہندوستان کی وہ زبان تھی جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے اس کے ہر شعبے پر انگریزی ادب کی چھاپ ملتی ہے۔ اُردو شاعری و تنقید انگریزی زبان و ادب کے ذریعہ نئی راہوں سے روشناس ہوئی۔''

الماس شیخ

ریسرچ اسٹوڈنٹ، کلکتہ یونی ورسٹی

شیکسپیئر کے شاہ کار ڈراموں کے اُردو تراجم ـــــــ

شیکسپیئر دنیائے ادب کا ایک ایسا آفتاب ہے جس کی روشنی سے دوسری تمام زبانوں کے ادب اپنی مسکراہٹ اور چمک حاصل کرتے ہیں۔ شاید ہی ایسا کوئی موضوع یا مسئلہ ہو جس پر ان کے قلم نے گل بوٹے نہ کھلائے ہوں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد ہمیں کچھ اور مطالعے کی ضرورت نہیں۔ جان کیٹس (Keats) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"He (Shakepeare) has left nothing to say about nothing or anything "

ان کی سوچ کی گہرائی گیرائی اور عمیق تجربات و مشاہدات نے ان کے فلسفے کو فلک کی اس بلندی تک پہنچا دیا' جہاں سے کچھ فاصلے پر پیغمبروں کی رسائی ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو مذہب کے معاملے میں طالبان نہیں ہیں' وہ انہیں ایک پیغمبر کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ جس طرح پیغمبروں کی تعلیمات تا قیامت رہے گی' اسی طرح شیکسپیئر کی تخلیقات بھی تا حشر بحیثیت خضر لوگوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ Carlyle اپنی کتاب "The Hero As Poet" میں لکھتے ہیں :

"The sun has set in the British Empire but in the Empire of the mind the sun of Shakespeare still shines."

میں سامنے آتے ہیں تو کبھی ''ترقی پسندوں کی اصطلاحیں اتنی مادّیت آلود ہوتی ہیں کہ ان سے تانبے کے زنگ آلود پیسوں کی بو آتی ہے'' (عسکری) جیسے جملوں کی شکل میں۔

اعلیٰ تنقیدی مؤقف اس بات پر زور دیتی ہے کہ فن پارے اور فن کار کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت نقاد کو اپنے ذاتی جذبات کو پس پشت ڈال کر فن پارے کو فن پارے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے اور اس کی قدر و قیمت بحال کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ہمارے یہاں دو رویے ملتے ہیں مثلاً فاروقی اگر کسی فن پارے کو اعلیٰ درجے کا فن پارہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو ان کے انکار میں ایک طرح کا ضبط پایا جاتا ہے جو چیزوں کو اس کا صحیح مقام دینا چاہتا ہے جبکہ وارث علوی کا انکار ایک دہشت پسند کا چیلنج ہوتا ہے جو اگر کسی چیز کو بحال کرتا ہے تو اس سے پہلے اسے پوری طرح تہس نہس کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ دراصل وارث علوی کی تنقید ''سر کاٹ کر دستار بندی'' کا عمل ہے مگر وارث ''سر'' کے انتخاب میں ہمیشہ محتاط رہتے ہیں۔

بے راہ روی اور غلطیاں ترقی کی مانع نہیں۔ اگلوں کی غلطی، پیچھے آنے والوں کو راستہ بھٹکنے سے بچا لیتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نقادوں نے جہاں عدم توازن کا شکار ہو کر غلط فیصلے کیے ہیں، وہیں ہمارے بعض بڑے نقادوں نے تعینِ مراتب کے سلسلے میں توازن سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً محمد حسن عسکری کا غالب کے مقابلے میں میر کو ترجیح دینا اور شمس الرحمٰن فاروقی کو اُردو تنقید کا ایک ہم موڑ کہنا، شمیم حنفی کا ''آگ کا دریا'' کو عالمی ادب کا شاہکار کہنا، وارث علوی کا شمس الرحمٰن فاروقی کے برعکس مجاز کو بڑا شاعر تسلیم کرنا وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

دراصل تعینِ قدر کے معاملے میں کوئی بھی نقاد مکمل غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جانبداری انسانی جبلّت کا ایک حصہ ہے۔ پھر بھی بڑے نقادوں نے بہت حد تک ذاتی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھ کر تعینِ مراتب کے سلسلے میں فیصلے سنائے ہیں۔ ویسے یہ امر بھی متنازعہ فیہ ہے کہ آیا کسی فن پارے کے مرتبے کا تعین نقاد کرتے ہیں یا قاری؟ اگر نقاد کو ترقی یافتہ قاری کی ایک شکل تسلیم کر لیا جائے پھر بھی بقول آل احمد سرور : ''نقاد مفتی نہیں ہوتا۔''

اب جب نقاد مفتی نہیں ہوتا تو کسی کے مرتبے کا فیصلہ کیوں کر کر سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

ان میں لسانی تبدیلیوں کے ادراک کے بغیر تجزیئے کی دنیا میں سفر تو کیا جاسکتا ہے مگر منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ شعر کی بناوٹ میں ہیئتی کارفرمائیاں ہوتی ہیں ان سے اُسلوب کا سلسلہ کیوں اور کیسے ملتا ہے' لفظ کے مخفی اور صوتی اشاروں کی کیا اہمیت ہوتی ہے' استعارے پیکر تراشی میں کیا مدد کرتے ہیں' اس سے متعلق بحث اگر تجزیئے کے دوران ہو تو متن کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔

اور پھر سب سے آخر میں تنقید کا وہ مقصد سامنے آتا ہے جس کے لیے ساری بزم آرائیاں کی جاتی ہیں' یعنی تعینِ مراتب۔ تنقید کا یہ وہ مرحلہ ہے جس کی بے راہ روی کو کچھ اس طرح مطعون کیا گیا کہ ملاح بھی پانی مانگنے لگے۔ دراصل تنقید کا یہ وہ اہم موڑ ہے' جہاں پہنچ کر اکثر نقاد تعصب کا شکار ہو کر اپنے مطالعہ کی اور بجنٹلی کو خود اپنے ہاتھوں سے تہس نہس کر دیتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کا غالبؔ کے مقابلے میں ذوقؔ کو بڑھاوا دینا' نیازؔ کا جوشؔ کے مقابلے میں علی اختر جیسے لوگوں کو اُبھارنا' کلیم الدین احمد کا عظیم الدین احمد کو عظیم شاعر کہنا' احتشام حسین کا نظیرؔ کو عظیم شاعر تسلیم کرنا' شمس الرحمٰن فاروقی کا افسانے کو دوسرے درجے کی صنف کہنا اسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے۔

فن پارے کے تعینِ مراتب میں اکثر نقاد ''لوبی'' کے شکار ہو کر خود اپنی تنقید کا نقصان کرتے ہیں کیوں کہ فن کی کچھ بنیادی قدریں ہیں جو فن کو زندگی بخشتی ہیں۔ مثلاً اگر سردار جعفری نے فیضؔ کی نظم ''تنہائی'' کو پاکستانی حکومت کا ملکی ترانہ کہہ دیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نظم ''تنہائی'' ادبی اعتبار سے کم تر ہو گئی۔ میں نے کہا ہے کہ متن میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ سردارؔ کا قول آج کم لوگوں کو یاد ہے لیکن ''تنہائی'' کے دو تین مصرعے تو فیضؔ کو دلچسپی سے پڑھنے والے تقریباً ہر شخص کو یاد ہوں گے۔

تعینِ مراتب کے سلسلے میں ہمارے نقادوں نے جہاں بخالت سے کام لیا ہے' وہیں کہیں کہیں اتنی فیاضی دکھائی ہے کہ بے ساختہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ آغا حشرؔ کو تخلیق کی غیر معمولی صلاحیت کا مالک اور حیاتِ انسانی کے حیرت خیز مصور شیکسپیئرؔ کے مماثل قرار دینا' پریم چند کے ناول ''گئودان'' کو ڈکسنؔ' ٹالسٹائی اور فلابیرؔ کے ناولوں کے مقابلے میں رکھنا وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ دراصل تعینِ مراتب کے دوران جو چیز سچ کے راستے میں حائل ہوتی ہے' وہ ذاتی جذبات ہوتے ہیں جو کبھی ''ہندستان کی [illegible] کتابیں دو ہیں: مقدس وید اور دیوانِ غالب'' (بجنوری) جیسے جملے کر [illegible]

تجزیہ کے دوران نقاد معنی اور ساخت کی اس وحدت کو اپنا مسئلہ بناتا ہے جو نامیاتی ہوتی ہے اور اگر نقاد ان باتوں سے توجہ ہٹالے تو بقول فاروقی :

''ترجمانی کی بدعت کا شکار ہو جاتا ہے۔''

تجزیہ کے دوران نقاد کا حلیہ اس وقت بگڑتا ہے جب اس کا سامنا ''دریدا'' کی طرح کے متن یا پھر ''باختن'' کے کثیر الصوت متن سے ہوتا ہے۔ اس قسم کا متن اپنے گرد ابہام کا وہ طلسم رکھتا ہے جس کو توڑنے کا منتر صرف عظیم نقادوں کے پاس ہی ہوتا ہے۔ میر کا شعر ہے :

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

اس متن کا تجزیہ کرتے وقت اور چیزوں کے علاوہ اس امکان پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے کہ ''زنداں میں بھی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ شورش جنوں کے علاج کی اور بھی تدبیریں ہو چکی ہیں اور ناکام رہی ہیں (فاروقی) اور پھر اس کے تخلیقی مشتملات اور صوتی امکانات کو فاروقی کے ہی لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے :

''شورش کے ساتھ آشفتہ سری کتنا مناسب ہے اور خود شورش اور جنوں میں رعایت معنوی ہے۔ لفظ ''سنگ'' جس آہنگ سے مصرعے میں استعمال ہوا ہے وہ خود اشارہ کرتا ہے کہ سر کو دھماکے کے ساتھ پتھر سے ٹکرانا ہے۔''

(شعر شور انگیز، جلد اول، ص:۲۴۹)

تجزیہ کے دوران نقاد اور متن میں ایک مہابھارت سی چھڑی رہتی ہے۔ نقاد، متن کو تجربے کے نورانی دائرے میں لا کر بے لباس کرنا چاہتا ہے مگر متن اپنی پُراسراریت کی بنا پر چھوئی موئی ثابت ہونے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر بڑا نقاد متن کو قابو میں کر کے اسے تجزیئے کے آئینے کے روبرو لا کر معنی آفرینی کے عمل کو جنبش دے دیتا ہے اور اس طرح عکس در عکس کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اُصولِ تجزیہ 'شعری فکر کی توسیع و ترسیل محرکاتِ شاعری' الفاظ کی دنیا' ان کے محل اور تمثیلی پرچھائیوں کا احساس، قواعد و علم عروض کی واقفیت اور الفاظ کے صوتی نظام کے ساتھ ساتھ

کاش ایک بار مجھ سے میرا مدعا پوچھ لیا جائے تا کہ میں کھری کھوٹی سنا کر اس سے ہمیشہ کے لیے راہ ورسم قطع کرلوں۔ جیسا کہ ظفر اقبال (پاکستان) کا یہ بالکل نیا تجربہ ہے :

آ کر وہ میری بات سنے اور جواب دے
گر یوں نہیں تو پھر یہ شناسائی ختم ہو

دراصل تنقید میں جس قسم کی تشریح درکار ہوتی ہے، وہ مکتبی تشریح سے کم ہی علاقہ رکھتی ہے۔ مکتبی تنقیدی تشریح میرؔ کے اس مشہور شعر :

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہِ شیشہ گری کا

کی تشریح ان لفظوں میں کبھی نہیں کرسکتی :

''صاحبِ نظر جب کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کی رنگا رنگی اور پیچ در پیچ نزاکت کو دیکھ کر حیرت میں آجاتا ہے ہر چیز انتظام سے چل رہی ہے، کہیں کوئی انتشار نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی نازک اور پیچیدہ کارخانہ ہے صاحبِ نظر کو محسوس ہوتا ہے کہ اگر زور کی سانس بھی لی تو یہ سب درہم برہم ہوجائے گا یا شاید یہ سب کچھ ایک خواب ہے جو ذرا سے اشارے پر برہم اور منتشر ہوسکتا ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد اوّل، ص:۲۵۲)

پتا یہ چلا کہ تنقید جس قسم کی تشریح کا مطالبہ کرتی ہے، وہ محض متن میں استعمال کیے گئے الفاظ کے معنی بیان کردینے کا نام نہیں بلکہ الفاظ کی کائنات کو کشادہ کرنے اور متن کے معنیاتی دائرے کو ایک ''Hierachy'' کی صورت میں پھیلانے کا نام ہے۔

تشریح کے بعد تنقید کو جس چیز کی حاجت پیش آتی ہے، وہ تجزیہ ہے۔ اس عمل کے دوران فن پارے میں مضمران ترکیبی اجزا و مشتملات کے ابہامات (تکثیر معنی) اور باہمی پیچیدہ رابطوں کا مفصل اور دقیق تجزیہ مقصود ہوتا ہے جو تدریجاً اس کی تحلیل و تحمیل کرتے ہیں۔ ''آئی اے رچرڈز'' اور ''ولیم ایمپسن'' نے ادبی مطالعات کے ضمن میں انہیں بنیادوں پر فن پارے کو اوّلیت دی ہے۔

اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ تنقید کے منصب اور مقصد کا تعین بڑے حوصلے کا کام ہے لیکن اس سے بڑے حوصلے کا کام ہم جیسے طالب علموں کا ان نظریوں کو تسلیم کرنا ہے مگر ایمان کی پوچھیے تو تنقید کے منصب اور مقصد کے تعلق سے اس قول پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے جس سے مغرب میں ایلیٹ اور مشرق میں شمس الرحمٰن فاروقی مشترکہ طور پر متفق ہیں :

''تنقید کا اوّلین اُصول یہی ہے کہ وہ معروضی ہو اور معروض کی ماہیت کا مطالعہ اور تجزیہ اس کا مقصد ہے۔''

مذکورہ اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تنقید کا کام معروضی انداز میں تشریح اور تجزیہ کے توسّط سے متن کے مرتبے کا تعین کرنا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا معیار کیا ہونا چاہیے؟ کیا تشریح کے لیے صرف یہ کافی ہے کہ میرؔ کے اس مصرعے :

صد موسمِ گل ہم کو تہہ بال ہی گزرے

کے متعلق یہ لکھ دیا جائے کہ سیکڑوں موسمِ گل متکلم نے اپنے بال و پر میں سر کو نہوڑ کر گزار دیئے یا پھر اس مصرعے کی تشریح یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ متکلم کی ساری زندگی رسوائے پر و بال رہی۔ مسلسل پرواز میں اس کی زندگی بسر ہوئی' آرام سے کہیں بیٹھنے کا موقع ہی میسر نہیں آیا یا پھر خلیل الرحمٰن اعظمی کے لفظوں میں :

نہ ہوا یہ کہ تہہ دام کبھی سو رہتے
زندگی اپنی تو رسوائے پر و بال رہی

غالبؔ کا یہ شعر ہمارے یہاں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے :

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھے کہ مدعا کیا ہے

اس متن کی تشریح میں یوسف حسین خاں کی طرح صرف یہ لکھ دینا کہ متکلم معشوق کی زبانی مدعا کے پوچھے جانے کا منتظر ہے' کافی نہیں بلکہ اس متن کے لیے فاروقؔی کی طرح کی تشریح درکار ہے۔ یعنی ایسا بھی ممکن ہے کہ مسلسل بے اعتنائی سے تنگ آکر متکلم قطعی لہجے میں یہ کہہ رہا ہے کہ

اس کے تجزیے اور تشریح تک محدود کر دیا ہے۔ آج دریدا کی رَدِّ تشکیل اور "Post Modernism" میں متن کی "Self Reflexivity" پر اصرار کیا جا رہا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ معنی کی تلاش متن کے الفاظ میں نہیں بلکہ ان کے رشتوں، متن کے وقفوں اور اس کے سیاق وسباق میں کی جانی چاہیے۔

پس ساختیاتی قضایا نے بقول شافع قدوائی :

''اس عام فہم تصور پر کاری ضرب لگائی کہ ادب کسی تجربے کے اظہار کا نام ہے۔ حقیقت فی نفسہ اضافی ہے' ادب اس کی دریافت بلکہ اس کو خلق کرتا ہے۔ اس طرح ہر متن میں "Self Reflexivity" پائی جاتی ہے یعنی "Text" کا حوالہ خود Text ہی ہوتا ہے۔ سریندر پرکاش نے ''بجوکا''، ''بھولا کی واپسی'' جیسے افسانے لکھ کر پہلے سے موجود "Text" پر اپنا "Text" تیار کیا ہے۔''

(اُردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ص: ۳۵۷)

گویا بدلتے ہوئے عالمی اور ملکی ادبی تناظر میں اُردو ادب میں بھی تنقید نگار تخلیقیت کی تشکیل اور تعمیر میں مستغرق ہیں۔ تھیوری کی رہنمائی میں تنقید کے مختلف دبستان وجود میں آ گئے ہیں جن میں نوآبادیاتی تنقید، نومارکسیت، تانیثی تنقید، نئی تاریخیت اور قاری اساس تنقید کے طریقۂ کار، حدود، اس کے اطلاق اور ان کے فطری مباحث کی افادیت کے تعلق سے عمل اور رَدِّ عمل کا ایک لامتناہی سلسلہ برِصغیر کے مقتدر ادبی جرائد میں جاری ہے لیکن کسی بھی نظری ڈِسکورس اور نئے تنقیدی محاورے کا چلن قائم ہونا آسان عمل نہیں، کیوں کہ اپنی تھیوری پر اصرار کرنے والوں کے لیے نئی صورتِ حال کو قبول کرنا ایک دشوار عمل ہوتا ہے۔ کچھ یہی صورت فی زمانہ اُردو میں نظر آ رہی ہے اُردو کے سربرآوردہ نقّاد ایسے کہ جنھیں نظریہ ساز کی حیثیت حاصل ہے' اپنی اپنی دستار بچانے کے چکّر میں ہیں۔ ہر کوئی اپنے تنقیدی دبستان اور تھیوری کا نقیب بن کر ''باادب، باملاحظہ'' پکار رہا ہے۔ ان حالات میں تنقید کے منصب اور مقصد کا مسئلہ متنازعہ فیہ رہنا کچھ عجب نہیں اور فی زمانہ یہ مسئلہ ہنوز متنازعہ ہی ہے۔

ندیم احمد
ریسرچ فیلو، کلکتہ یونی ورسٹی

جدید تنقید ——

منصب اور طریق کار کی جستجو

تنقیدی ڈسکورس کی حدیں حتمی طور پر متعین نہیں ہیں۔ تنقید کے منصب، مقصد، وظیفے اور نوعیت کے تعلق سے مغرب میں ارسطو سے لے کر رچرڈز اور ایلیٹ تک اور مشرق میں حالی سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک بے شمار خیالات بکھرے پڑے ہیں جو کہیں کہیں اگلے خیالات کی بازگشت اور توسیع بھی ہیں، کہیں رَدّ بھی۔ آج جب "Liberal Humanism" کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا ہے تو اس صورتِ حال سے نہ صرف یہ کہ آزاد خیال انسان دوستی کی جگہ "Theory" نے لے لی ہے بلکہ اس تبدیلی نے عالمی ادب میں تنقید کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔

"New Criticism" کے نظریہ سازوں نے ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ فن کا سیاق ہی ایک اپنی کائنات ہوتا ہے جس کی فہم کے لیے کسی بھی سوانحی، تاریخی یا اخلاقی حوالے کی مدد کے معنی اس متن کے خود یافتہ معنی کو جھٹلانے کے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرزِ تنقید نے معنی کو متن تک محدود کر کے تنقید کے کام کو سیاق و سباق کے حوالوں کے بغیر متن کے دائرے میں رہ کر

5. The Contours of Masculine Desire
(Romanticism and The Rise of Women's Poetry)
Marlon B. Ross
Oxford University Press, 1989.

6. Feminity as Alienation
By Ann Foreman
1st. Published Pluto Press, 1977.

7. Feminist Literary History - A Defence
By Janet Todd
Polity Press, 1988.

☆☆☆☆

میدانوں میں بھی ان کا مطالعہ آگے بڑھ رہا ہے اور وہ نسائی تحریک کے بدلتے ہوئے تصورات میں شریک رہی ہیں۔

(زیرِ تصنیف "فیمینزم-تاریخ وتنقید" کا ایک حصہ)

☆☆☆☆

حوالے

1. Women in German History
   From Bourgeois Emancipation to Sexual Liberation
   By Lite Frevert, Tr. By. Stuart Mc-Kinnon-Evans
   in association with Terry Bond and Barbara Nordem
   St. Martine's Press - New York, 1988.

2. Social Change and Political Development in Weiner Germany
   ed by. R. Bessel and E. J. Feuchtiwanger, London 1981.

3. German Women in 18th and 19th Centuries
   ed. by Rut-Ellen Joeres and Mary to Maynes
   Bloomington, Ind, 1986.

4. Feminism and Motherhood in Germany (1800-1914)
   Ann Taylor Allen
   Rutgers Universty Press. New Brunswick, New Jersey 1991.

Sigrid میں (1983) "Double Focus : On the History of Women's Writing" Weigel (1950-) نے نسائی تحریروں کی دوبارہ دریافت پر زور دیا۔ اس نے عورت کی نظر میں عورت کے مقام کا مطالعہ بھی ضروری سمجھا۔ اسے وہ ''آئینے کا عکس'' (Mirror Image) کہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس مطالعے سے عورت کے دوہرے وجود کے ابہام (Ambiguities) پر سے پردہ اُٹھ سکے گا نیز اس حقیقت پر روشنی ڈالی جا سکے گی کہ عورت' مردوں کے بنائے ہوئے سماج میں کہاں کہاں ہے اور کہاں کہاں نہیں ہے۔

Ginka Steinwachs (1942-) ایسی آرٹسٹ ہے جو جسم کو ایک مادّہ کے طور پر استعمال کرنے میں یقین رکھتی ہے۔ The Palatheater of the Mouth میں وہ (Sprachmusik) Language Music پر زور دیتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ Oral Cavity ادائیگی کا ایسا مقام ہے جہاں زبان کا جسم اور جسم کی زبان ایک ہو جاتے ہیں۔

Libese Moni میں (1997) Some Thesis Regarding Women's Writing Kova (1945-98) نے اس بات پر زور دیا کہ عورتوں کی تحریر کو الگ خانے میں رکھنے کے بجائے اس پر زور دیا جائے کہ انکے یہاں بھی ذہن ہے۔ Verena Stephen (1947-) نے اسی دوران اپنی کتاب Shedding (1975) کی وجہ سے مقبولیت حاصل کی۔ Cacophony (1994) میں اس نے جرمنی میں نسائی تحریک' اپنے تشخص کے بحران (Crisis) اور اس پر قابو پانے کی کوششوں کو پیش کیا۔

Anna Mitgutsch (1948-) نے 1996 میں پھر ایک بار یہ سوال اُٹھایا کہ "What is Women's Literature?" اس کا کہنا تھا کہ عورت تخلیق کاروں کی تعداد میں اضافہ مردوں کے لیے تشویش کا باعث بن رہا ہے اور اس لیے وہ نسائی تجربات، نسائی اظہار اور تصورات کو Marginalize اور Trivialize کرنے میں لگے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ نسائی ادب کو سمجھنے کے لیے مواد پر زور دینے کے بجائے نسائی جمالیات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جرمنی میں عورتوں کے سوچنے کی رفتار سست نہیں ہوئی ہے بلکہ شعر و ادب، فلم اور دوسرے

کے حقوق طے کر دیئے گئے۔ اس کا کہنا تھا کہ مرد اور عورت کے زندگی گزارنے کے طریقے الگ الگ ہیں' لہٰذا اسی طرح اس کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔ دوسری طرف مغربی جرمنی میں عورتوں کے الگ ادبی منظرنامے کی روشنی میں یہ سوال بھی اُٹھا کہ کیا عورتوں کی الگ جمالیات ہے۔ Silvia Bovenschen (1946) نے ایک مضمون "Is there a Feminine Aesthetic" (1976) میں نہ صرف فراموش کر دی گئیں عورت تخلیق کاروں کی ازسرِ نو دریافت پر زور دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ عورت اور مرد کے اختلافات' نقصان' کم تری اور ایسے ہی دوسرے تصوّرات کو جنم دینے کے بجائے بہتر مواقع کی تلاش پر زور دیں تو اچھا رہے گا۔

Morgner کی طرح Bovenschen کا بھی یہی کہنا تھا کہ عورت کے تجربے اس کی جمالیات کی تشکیل کرتے ہیں نیز یہ کہ عورت کی جمالیات کا اندازہ اس کے روزانہ کے تخلیقی کاموں سے ہوتا ہے مثلاً سینا پرونا، کاڑھنا وغیرہ یا ڈائری اور مکتوب نگاری سے۔

بہت دنوں تک عورتوں کی تحریر سے بے اعتنائی برتی گئی۔ حتیٰ کہ عورتوں نے اپنے پبلشنگ ہاؤس بنا لیے۔ 1977 میں Angeliker Mechtel (1943) نے اپنے مضمون "The White Raven has learnt to fly" میں صاف طور پر لکھا کہ عورتوں کے ساتھ بے اعتنائی برتی جا رہی اور پبلشنگ ہاؤس انکے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہیں کرتے۔ 1980 میں جرنلسٹ Gabriele Dietz (1951-) نے Over Coming Speechlessness میں لکھا کہ عورتوں کے گروپ میں ایک خاص طور کا رابطہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اس بات کے خلاف ہے کہ عورتوں کے لہجے کو کسی ایک مخصوص روایت سے جوڑ دیا جائے اور مرد اور عورت کی رٹی رٹائی تفریقات پر بحث چلے یا ان کے تضادات کی بنیاد پر انکی پہچان مقرر ہو۔ Jutta Bruckner (1941-) جو ایک فلم ساز تھی' کہا کہ عورتیں فلم میں حقیقت کے بجائے fantasy امیج کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ Pornographic Cinema کی وجہ سے عورت کی توجہ مردوں کے جسم پر مرکوز ہو گئی ہے۔ "The Spot of Blood in the Eye of the Camera" (1981) میں اس نے کہا کہ عورتیں چوں کہ مردوں کی طرف Pornographic طور پر دیکھتی رہی ہیں' اس لیے اپنی طرف بھی اسی نظر سے دیکھتی ہیں۔

(1730-1807) نے اپنے گھریلو مصائب کا ذکر کیا اور بتایا کہ کیسے گھر کے تمام لوگوں کی ذمہ داریاں نبھا کر وہ اپنے پڑھنے لکھنے کے لیے وقت نکالتی ہے۔ بعد کے دنوں میں بھی عورتوں نے ان ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے لیکن Sophie کے یہاں ان فرائض کو نبھاتے ہوئے ایک طرح کی رضا مندی ملتی ہے جو اُنیسویں اور بیسویں صدی کی عورتوں کے یہاں نہیں ہے۔ Fanny Lewald نے مردانہ نام سے لکھا کہ وہ اپنی تحریر کو منوانا چاہتی تھی۔ Rosa (1858-1938) Mayreder اپنے وقت کے رسائل میں ان رومانی قصوں کے خلاف تھی جن کا اشارہ عورتوں کی جانب ہوتا تھا۔ Lily Braun نے Back Stage (1894) میں اسٹیج ایکٹریسوں کے متعلق غلط قسم کے تصور پر ضرب لگائی۔ عام رائے یہ تھی کہ اسٹیج پر کام کرنے والی عورتیں بدکردار ہوتی ہیں اور مردوں کو آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایکٹریسوں کا شاندار رہن سہن دیکھ کر شادی شدہ عورتوں کو ان سے حسد کرنے کے بجائے اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ یہ عورتیں روزی روٹی کے لیے چند امیر لوگوں کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں اور ساری زندگی استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔ گرچہ جرمنی میں عورتوں نے تھیٹر میں بھی حصہ لیا لیکن ڈراما نگار کی حیثیت سے بہت مقبول نہ ہو سکیں۔ یہاں تک کہ ایک ڈراما نگار Marieluise FleiBer (1901-74) نے اپنے محدود صلاحیت کا خود ہی اظہار کیا ہے۔ Women's Dramatic Sensibility (1930) میں اس نے لکھا ہے کہ ڈراما نگار کے لیے انسانی idiosyncracies کی معلومات ضروری ہے، ورنہ مختلف مناظر کو ایک دھاگے میں پرونا مشکل ہوگا۔

قومی سماجیات (1933-45) کے زمانے میں جنگِ عظیم کے فوراً بعد نسائی تخلیقات کی رفتار سست پڑ گئی لیکن 1970 کے آس پاس تحریک کے از سرِ نو پیدا ہونے پر مابعد جنگِ عظیم عورتوں کی نفسیاتی اُلجھنیں، ان کے تجربے، مغربی اور مشرقی جرمنی کی درمیانی دوری اور اس کے نتائج وغیرہ پر غور و خوض کیا گیا۔ مشرقی جرمنی کی ایک مصنفہ Irmtraud Morgner (1933-90) نے ایک انٹرویو میں صاف طور پر کہا کہ جرمنی میں کسی نسائی تحریک کی غیر موجودگی میں لکھنا بہت کٹھن کام ہے۔ یہاں تحریک چلانے کے بجائے ریاستی حکومت کی طرف سے ایک اعلان کے ذریعہ عورتوں

ماہرینِ نفسیات کے غلط تصور پر کاری ضرب لگائی۔ Elizabeth Moltmann (1926) Wendel نے اس تصور کو رد کیا کہ عورتیں عالم دینیات نہیں ہوسکتیں۔ گرچہ جرمن یونی ورسٹی میں بڑے اہم اور نامی گرامی عالمِ دینیات پہلے سے موجود تھے لیکن نسائی دینیات کو اپنی جڑیں مضبوط کرنے میں کافی وقت لگا۔ ایلزبیتھ پہلی عالمِ دینیات تھی۔ اس نے Feminist Thelogy میں (1985) آزادی، دینیات اور نسائی تحریک کے آپسی رشتوں پر نظر ڈالی۔

Luise Pusch (1944) نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ کتاب Language is publicity for men but enough is enough میں دکھایا کہ کیسے جرمن زبانیں عورتوں کو دبا کر رکھتی آئی ہیں۔

شعر و ادب کے میدان میں بھی جرمن عورتوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے لیکن ان میدانوں میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے انہیں شدید جدوجہد کرنی پڑی۔ ابتداً انہوں نے اپنے نام ظاہر نہیں کیے اور اکثر اوقات مردوں کے نام سے لکھتی رہیں۔ عموماً عورتوں کی تخلیقات کو کم تر گردانا جاتا تھا اور جنسی تفریق کی بنیادوں پر اس کا معیار مقرر ہوتا تھا۔

1970 میں نسائی تحریک جب از سرِ نو بیدار ہوئی تو جرمن عورتوں کی تحریریں بہت تیزی سے منظرِ عام پر آئیں جن میں عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ایک عرصے تک انہیں نسائی تخلیقات کے دائرے میں رکھ کر ان سے بے اعتنائی برتی گئی۔ اس کے بعد عورتوں کی تخلیقی تاریخ کی تدوین شروع ہوئی اور ماضی کے دفینے کو کھنگالنے کا کام شروع ہوا۔ بعدازاں عورتوں نے لٹریچر کے علاوہ فلم اور دوسرے فائن آرٹس میں بھی اپنی الگ پہچان بنالی۔

گرچہ امریکی یونی ورسٹیوں میں عورتوں کے الگ اسٹڈی پروگرام تھے لیکن جرمن میں متفرق اداروں نے اپنے اپنے طور پر آزادانہ کام کیے اور سرکاری اداروں سے باہر عورتوں کے مسائل پر زیادہ بحث ہوئی۔

ایک اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورت جن سماجی تعصبات کا شکار ہوتی ہے، ان کا اظہار Annette Von Droste-Hulshott (1797-1848) کی نظم On the Tower (1842) میں ہوتا ہے جو انیسویں صدی کی سب سے اہم جرمن شاعرہ گزری ہے۔ Sophie Von Roche

"Abortion (1981) سے متعلق اپنے تجربے کا بیان کیا۔ وہ عورتوں کے ایک میگزین Emma کی ایڈیٹر تھی۔ The function of sexuality in the oppression of women (1975) میں اس نے صاف طور پر لکھا کہ مرد اور عورت کے جنسی اعضا ہی حکومت اور محکومیت کی وجہیں ہیں۔ 1970 میں علیحدگی پسندی کی لہر چلی۔ گرچہ علیحدگی کا تصور پہلے بھی جرمن روایت کا حصہ رہا ہے لیکن Marielouise Janssen-Jurreit (1941-) کے مضمون The Future of (1976) Feminism میں اس سوال کو ایک بار پھر اُٹھایا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ عورتوں کے علیحدہ ادارے، علیحدہ تنظیمیں ہونی چاہئیں۔

1970 کے آس پاس عورتوں کو چڑیل سمجھ کر مارنے پیٹنے کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ Take back the night کے نام سے نسوانی انجمنوں نے مارچ کیا اور عورت پر ظلم و تشدد کے خلاف آواز اُٹھائی۔ Silvia Bovenschen کا مضمون (1981) اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ "The contemporary witch, the historical witch and the witch myth" میں اس نے چڑیل کے بدلتے ہوئے تصوّرات پر روشنی ڈالی۔ باپ، بھائی، شوہر، بیٹے کے ہاتھوں عورت کے استحصال اور زدوکوب پر بھی سنجیدگی سے سوچا گیا اور عوامی مباحث میں ان موضوعات کو شامل کیا گیا۔ مسائل کے حل کے طور پر عورتوں کے لیے ایسے ہوم کی تعمیر پر زور دیا گیا جہاں وہ محفوظ رہ سکیں۔ For the Dignity of Women (1981) کے عنوان سے ایک تقریر میں (1905-94) Karola Boch نے ایسے محفوظ گھروں کی حمایت اور انہیں جلد از جلد تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا۔ Karola ایک Architect اور سیاسی رہنما تھی۔ اس نے عورتوں پر ظلم و استبداد کو اس سماج کا پرتو مانا۔ وہ سماج جو مردوں کا پروردہ ہے اور عورتوں کو زیر کرنے میں یقین رکھتا ہے۔

کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جو نسائی تحریک سے پورے طور پر متفق نہیں تھیں۔ مثلاً Monika Treut جس نے اپنے مضمون The ceremony of the bleeding Rose : Preliminary Reflections on a film project (1884) میں جنسی اور ہیجانی مناظر کی سنسر شپ پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ ماہرِ نفسیات Margarete Mitscherlich (1917) نے عورت کی جنسیت سے متعلق

کہتی ہے)۔اس نے What interests does the women's movement have in the Homo-Sexual question (1904) میں لکھا کہ ایسی عورتیں ہر طرح کے سماج' طبقہ اور خاندان میں پائی جاتی ہیں۔اس نے عورتوں سے اپیل کی وہ ایسی عورتوں کو برابر کی عزت دیں اور ان کے اختصاص کو سمجھنے کی کوشش کریں جو عام عورتوں سے الگ اور مختلف ہیں۔

Adele Schreiber (1872-1957) وہ پہلی عورت ہے جس نے یونی ورسٹی تک کی تعلیم حاصل کی۔اس نے عورتوں کے حقِ رائے دہندگی کے لیے بھرپور لڑائی لڑی اور ماؤں کے حقوق کی حفاظت کو اپنا موضوع بنایا۔اس نے Unwed Mothers (1912) میں غیر شادی شدہ ماؤں کی حمایت میں مضمون لکھا اور ان پر لعن طعن کرنے اور انہیں اپنی نفرت کا نشانہ بنانے سے پہلے ان سماجی عوامل پر غور کرنے کے لیے کہا جن کے تحت وہ ناجائز بچوں کی ماں بنتی ہیں۔اس نے اس Double Standard کی بھرپور مخالفت کی۔ بورژوا نسائی تحریک کے بایاں گروپ سے نکل کر جب وہ سوشلسٹ پارٹی میں آئی تو اسی پارٹی کی نمائندے کی حیثیت سے Reichstag میں بیٹھتی رہی (1928-1933) اس کے بعد وہ جرمنی سے بھاگ گئی اور انگلستان اور سوئٹزرلینڈ میں ایک Activist کی حیثیت سے اس نے بقیہ زندگی گزاری۔

Helene Stocker (1869-1943) نطشے کی پیروکار تھی۔اس نے بھی جنسی اخلاقیات میں اصلاحات پر زور دیا۔عورتوں کے اپنے جسم پر اختیار کے حق کی لڑائی میں قانون اسقاطِ حمل کا نکتہ بھی شامل تھا۔

1924 کے ایک Lithograph میں Kathe Kollwitz (1867-1945) نے اسقاطِ حمل کی حمایت کی۔ یہ لیتھوگراف دراصل اُس تحریک کا حصہ تھا جس کے ذریعہ جرمن پینل کوڈ کے اقتباس 218 کو باطل کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔(اس پیراگراف کے تحت 1871 تک اسقاطِ حمل کو جرم مانا گیا تھا) غرض ہر شعبۂ حیات سے متعلق لوگ اس تحریک میں شامل ہو گئے جو اسقاط کو قانونی شکل دینے کے لیے چلائی گئی تھی۔1970 میں ایک بار پھر اس سلسلے کی تحریک چلی۔ایک صحافی Alice Schwarzer (1942-) نے اپنے مضمون "How it All Began : I Have Had an

کہ جسم فروشی کی وجہ غربت ہے۔ لہٰذا یہ ہر عورت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ غربت سے مجبور جسم فروش عورتوں کی زندگی بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ 1970 کے بعد فیمنسٹوں نے عورتوں کو جسم فروشی کو ایک پیشے کے طور پر اپنانے کی آزادی دینے کی بات کہی اور انہیں ریاستی پنشن اور ان کیلئے دوسری مالی منفعتوں کی مانگ کی۔ "Three Doctors as Knights of the Mater Dolorosa" میں Hedwig Dohm نے ان مرد ڈاکٹروں پر تنقید کی جو عورتوں کو ان کے تولیدی اعضا تک محدود کر دیتے ہیں۔ اس نے حیض، حمل اور زچگی کو سماج میں ایک اہم مقام حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹیں بتائیں۔ جب Dohm ستر سال کی تھی تو اس نے The Old Woman (1903) لکھا اور اس میں بڑھاپا کے متعلق منفی تصوّرات کی مخالفت کی اور کہا کہ ایک عورت کو بڑھاپے میں بھی ایک فعال زندگی گزارنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ وہ بوڑھی عورتوں کے سفید لباس پہننے پر زور دیتی ہے اور ان کے زہد و تقویٰ پر بھی اُسے اعتراض نہیں لیکن اس کا کہنا ہے کہ بوڑھی عورتوں سے زیادہ جمالیاتی حس کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ انہیں صاف ستھرا رہنا چاہیے، طبّی اُصولوں کی پابندی کرنی چاہیے یعنی ہر وہ اُصول جو اُسے صحت مند اور پھرتیلا رکھ سکیں۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی جہدِ مسلسل ہے۔ ساری زندگی انسان اپنے دشمنوں سے لڑتا رہتا ہے۔ بڑھاپا بھی دشمن ہے، اس لیے اس سے لڑائی ضروری ہے۔ وہ ان لوگوں پر تاسّف کرتی ہے جو عورت کی قیمت اس کے حسن و جوانی کی بنا پر مقرر کرتے ہیں :

> "So the measure of a woman's value is her sexual attractivenss and usefulnes. This is a bestial and naively shameless conception of her essence. It may have been appropriate in former times, but such a view mocks the development and refinement of present day culture becauese it de-humanizes women."
>
> (Trans. by Hermington & Magda Mueller, Pg. : 203)

Anna Rueling نے ہم جنس (Lesbian) عورتوں پر قلم اُٹھایا۔ (وہ انہیں Uranian بھی

بنیادوں پر قائم کرنا یا نسائی فلموں پر سنسر شپ وغیرہ۔

Sidonie Hedwig Zauhemann (1714-40) نے ایک مجرد زندگی گزاری۔ اپنی نظم A Maids Fortune (1739) میں اس نے ان پریشانیوں کی نشاندہی کی جو سماج میں اپنے والدین یا عام اُصولِ زندگی سے انحراف کر کے زندگی گزارنے والی عورتوں کو اُٹھانی پڑتی ہیں۔ مثلاً والدین کی پسند کے مطابق شادی نہ کرنے سے۔ اسی طرح Fanny Lewald کی A Marriage Proposal (1862) میں باپ کے منتخب کردہ لڑکے سے شادی کرنے سے انکار کا حوصلہ بھی جرأت کا اظہار ہے۔

Louise Aston (1814-71) کی طرزِ زندگی عام لڑکیوں سے بالکل الگ تھی۔ "Banishment" (1846) میں اس نے اس خوف کا تذکرہ کیا ہے جو Prussian حکومت کو اس کے بیباک طرزِ عمل سے تھا۔ اس نے مردوں کے انداز میں زندگی گزاری۔ اس کے ملبوسات مردوں کے انداز کے ہوتے تھے۔ سگار کی شوقین تھی اور مردوں سے دانشورانہ گفتگو کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ Mathilde Franziska Anneka نے بھی Women in Conflict with Social Relations (1847) میں حکومت کے اسی خوف کا ذکر کیا ہے جس میں عورتوں کے Subversive Power کی وجہ سے حکومت مبتلا رہی تھی۔ بے جوڑ شادی کے خلاف Louise Dittman نے بھی لکھا۔ The Rational Marriage میں اس کے نظریات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ Irma Von Troll-Borostyani (1848-1912) نے بھی Shame (1896) میں شادی بیاہ کے رسم و رواج کا مذاق اُڑایا۔

گرچہ فیمنسٹوں کو ہمیشہ جسم فروش عورتوں کے استحصال پر اعتراض رہا لیکن انہوں نے کبھی اس سلسلے میں اصلاحات کی بات نہیں سوچی۔ Troll-Borostyani نے Postitution (1896) میں اپنے دور کی بہت سی فیمنسٹوں کا جائزہ لیا جو جسم فروشی کی کسی بھی ایسی ریاستی نگرانی کی مخالف تھیں جس کے تحت طبی اُصولوں کی پابندیاں صرف جسم فروش عورتوں کے لیے ضروری تھی، گاہکوں کے لیے نہیں۔ Lily Braun "A Manifisto to Germany's Women" (1908) میں لکھتی ہے

Liberalism of Women) ملتا ہے جو اس دور کی مقبول و معروف نسائی فلم ساز Helke Sander (1937-) نے دیا تھا۔ اسی سال اپنے مضمون Women in the SDS میں Ulrike Maria Meinhof (1934-1976) نے عورتوں کو ایک الگ راہ اختیار کرنے کی تجویز دی۔ ماریا ایک صحافی تھی، جسے بعد ازاں دہشت گردانہ رجحان کی بنا پر کافی بدنامی اُٹھانی پڑی۔ (وہ ایک بایاں بازو کے رسالے Konkert کی مدیرہ تھی۔)

1970 اور 1980 میں بھی جرمنی میں تحریکات کا سلسلہ رہا۔ اس دوران خیالات و نظریات میں بھی تبدیلی آئی۔ نسائی تحریکات اور حقوقِ نسواں سے متعلق نئے تصورات سامنے آئے۔ عورتوں پر جبر و استبداد سے متعلق ایک بہت اہم مضمون Christina Thurmer Rohr (1936) نے "Cross Thinking/Counter Questioning/Protest" کے عنوان سے لکھا جو عورت کے مظلوم ہونے والی حیثیت کو Deconstruct کرنے اور عورت کی اپنی Complicity سے متعلق اس کی اپنی روشن ضمیری پر نظر ڈالتا ہے۔

Berlin Wall کے Fall کے بعد 1990 میں جرمنی کی Unification کے بعد نئے حالات پیدا ہوئے اور فیمینیزم پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ اس دوران تقابلی جائزے کا بھی موقعہ ہاتھ آیا اور نتائج سے پتا چلا کہ مشرقی جرمنی میں عورتوں کی تحریک خود اختیاری (Autonomous) طور پر اس طرح سے آگے نہیں بڑھی ہے جس طرح کہ مغربی جرمنی میں Frigga Haug (1937-) نے "The End of Socialism in Europe : A New Challange for Socialist Feminism" (1992) میں مغرب کی مادّہ پرست نسائیت کے نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی جرمنی کی عورتوں پر ایک سرمایہ دارانہ بازاری معیشت (Capatalist Market & Economy) کے بدلتے ہوئے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

جنسی تفریق ہمیشہ ہی فیمینیزم کا موضوع رہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ایسے مسائل ہیں جو عورتوں کی زندگی میں زہر گھولتے رہے ہیں یا سماج میں ان کے مصائب کی وجہ رہے ہیں۔ مثلاً عورت کو چڑیل سمجھنا یا عمر رسیدہ عورتوں کا تلذذ کی طرف مائل ہونا یا زبان کے استعمال کو جنسی

"Her remarks in Female Pacifism (1917/1922)' however are grounded in an essentialist position that oppose the "female, constructive principle" to the "male destructive principle" leading her to assert the fundamental identity of pacifism with "female nature and instinct", an arguement that has been recycled throughout the twentieth century."

(Introduction, Page : XVIII)

مندرجہ بالا عبارتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ ہیمن نے نسائی تحریک کو کیسی تقویت عطا کی تھی۔

Gabriele Reuter (1859-1941) ایک صحافی تھی جس نے ناول بھی لکھے اور جن میں اس نے عورتوں پر عائد کردہ پابندیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ یہ پابندی Wilhelminian جرمنی میں ایک سماجی دستور کے تحت عورتوں کے Self-Fulfillment کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ حقِ رائے دہندگی عورتوں کے لیے ضروری ہے تاکہ مرد اور عورت کی درمیانی تفریق ختم ہو سکے اور عورت کو انسان سمجھا جا سکے۔

جب 1919 میں عورتوں کو حقِ رائے دہندگی حاصل ہوگئی تو اس حق کے استعمال کے سلسلے میں ان کی واقفیت میں اضافے کی خاطر ایلس سولومن نے The German Women and Her Task in the New Republic 1919 میں لکھی اور نئی مملکت کی تشکیل میں عورتوں کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔

نیشنل سوشلزم کی بنیاد پڑتے ہی پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمن عورتوں کی سیاسی شمولیت کا ایک دور ختم ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد والے دور میں عورتیں سیاست سے کنارہ کش ہوتی گئیں اور ایک بار پھر گھریلو ذمہ داریوں میں مشغول ہوگئیں۔ 1960 کی طلباء تحریک سے، جو ویت نام جنگ کے خلاف چلائی گئی تھی، ایک نئی نسوانی تحریک نے جنم لیا۔ 1968 میں وہ جنہوں نے 1960 کی طلباء تحریک چلائی تھی، مردوں کے سیاسی جدوجہد سے الگ اپنی تنظیموں کی بنیاد رکھنے لگیں۔ ان کے خیالات کا واضح اظہار اس تقریر میں (Speech of the Action Council for the

ساتھ مل کر کمیونسٹ پارٹی (لکسمبرگ) کا پارٹی پروگرام ترتیب دیا۔ 1919 میں برلن میں اسے Right Winger نے مار ڈالا۔ اپنے مضمون Women's Suffrage and Class (1912) Struggle میں اس نے صاف صاف کہا ہے کہ یونین کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے باوجود اور عورتوں کے حصولِ آزادی کے بعد بھی انہیں سیاسی سرگرمیوں میں اس وقت تک برابر کی شرکت نہیں حاصل ہو سکتی جب تک کہ پورے طور سے انہیں حقِ رائے دہندگی نہ حاصل ہو۔

Clara Zetkin (1857-1933) جرمن کمیونسٹ پارٹی کی ایک ممبر تھی۔ اس نے عورتوں کے مسائل پر شدت سے بحث کی۔ وہ Die Arbeiterin اور Die Gleichneit کی ایڈیٹر تھی۔ اس نے 1916 میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے War Credits میں ووٹنگ کی مخالفت کی تھی۔ 1917 میں وہ جرمن کمیونسٹ پارٹی کی ایک ممبر بنی لیکن اپنی دوست روزا لکسمبرگ کے برخلاف عورتوں کے مسائل پر اس کی توجہ نسبتاً زیادہ مرکوز رہی۔ "Women of the Working People" (1915) میں امن اور بین الاقوامیت سے متعلق اس کے خیالات اس وقت اور بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں جب وہ پرولتاری عورتوں کو اپنا موضوع بناتی ہے۔

Bertha Von Suttner (1843-1914) نے امن کیلئے آواز بلند کی۔ اس کا ناول Lay Down Your Arms (1889) میں شائع ہو کر خوب مقبول ہوا۔ 1892 میں اسے نوبل پرائز ملا۔ الفریڈ نوبل کو اس انعام کے قیام کے لیے ہمت افزائی کرنے والوں میں اس کا نام بھی آتا ہے۔ امنِ عالم کے لیے اس کے خیالات کا اظہار اس تقریر سے بھی ہوتا ہے جو پہلی جنگِ عظیم سے دو سال قبل امریکی عورتوں کی ایک محفل میں اس نے فرانسسکو میں (1912) کی تھی۔

Lida Gustavat Heymann جو نسوانی تحریک کی ایک رہنما اور Women's International Leage for Peace and Freedom کی بانی تھی، بورژوا عورتوں کی تحریک کے ریڈیکل گروپ سے تعلق رکھتی تھی۔ Anita Augspurg کے ساتھ اس نے امنِ عالم اور عورتوں کے "حقِ رائے دہندگی" کے لیے تحریک چلائی۔ اس کے بارے میں پیٹریشیا۔ اے۔ ہرمنگ ہاؤس اور میگڈا اٹلر کا کہنا ہے کہ :

You often borrow from our knowledge

more than is needed for your pleasure.

[Gerlind M. Geiger اور Susan L. Cocalise جرمنی سے ترجمہ]

Otto Peters اور Mathilde Franziska Anneke جیسی خواتین صحافیوں نے رسائل واخبارات کے ذریعہ عورتوں کے سیاسی حقوق کی حمایت کی۔ Hedwig Dohm نے اپنے مضمون The Right of Women's Suffrage (1876) کے ذریعہ عورتوں کو حق رائے دہندگی حاصل کرنے پر زور دیا۔ Kathe Schrimacher (1865-1930) نے اپنے مضمون میں ان حالات کی عکاسی کی جنہوں نے عورتوں کی ترقی میں روڑا بننے کی کوشش کی تھی۔ آسٹرین لڑکی Adelheid Popp کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اس نے بہت کم عمری سے مزدوری کی۔ 1885 میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی ممبر بنی۔ مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ پارٹی صحافت میں اس نے خوب نام کمایا۔ 1893 میں وائنا میں مزدور عورتوں کی پہلی اسٹرائیک میں حصہ لیا۔ آسٹرین پارلیمنٹ میں اس نے 1919 سے 1934 تک بیش بہا خدمات انجام دیں اور Clara Zetkin کی جگہ عورتوں کی بین الاقوامی کمیٹی کی چیئر پرسن بنی۔ پوپ نے The New Woman (1893) میں لکھا ہے کہ سماجی جمہوریت اسی حالت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا برابر موقع مل سکے گا' وہ معاشی طور پر آزاد ہو سکیں گی اور جب انہیں شہریت حاصل ہوگی۔

Rosa Luxemburg (1870-1919) جرمنی کی سیاسی دنیا میں ایک منفرد آواز تھی۔ روزا ایک اہم سیاستداں تھی اور اس کے رسوخ کافی وسیع تھے۔ جرمن مارکسزم اور عورتوں کی آزادی کے معاملے میں اس کی تھیوری روشن اور واضح تھی۔ Zurich یونیورسٹی سے اس نے دوبار ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ بیشمار مارکسی رسائل کی ادارت کی' مارکسی معاشیات کی درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے اور جرمن مارکسی تحریک کے Extreme Left Wing میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنی ذہانت اور تقریری صلاحیتوں کی وجہ سے اسے اپنے ہی وطن پولینڈ اور برلن میں بارہا جیل جانا پڑا۔ وہ اپنی Radical سیاسی مہارت کی وجہ سے مشہور تھی۔ 19-1918 میں اس نے Karl Liebknecht کے

اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے درمیان بہتر سے بہتر نوکری کی خواہش پل رہی ہے اور اب مردوں اور عورتوں کے مابین بہتر مواقع حاصل کرنے کے لیے تنازعات بڑھ رہے ہیں۔

برسرِ روزگار عورتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں اکثریت ٹیچروں کی تھی۔ Gertrud Baumer اپنے مضمون Female Teaching (1930) میں لکھتی ہے کہ سماج میں عورتوں کی تعلیم کو فروغ دینے میں ان ٹیچروں کا نمایاں رول رہا ہے۔ ان ٹیچروں نے نسائی تحریک کو آگے بڑھانے کا کام بھی کیا۔ اپنے پیشے کے تعلق سے ان کی شدید جدوجہد جرمن خاتون اساتذہ کی تنظیم کی صورت میں اُبھری۔ بیسویں صدی کے اواخر میں لوکل گورنمنٹ میں جنسی تفریق کا خاتمہ اس کا ثبوت ہے کہ برابری اور مساوات کے لیے ان عورتوں نے کتنی ان تھک لڑائی لڑی ہے۔

سیاسی میدان میں بھی عورتوں کی ترقی قابلِ غور ہے۔ 1918 میں پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کی شکست کے بعد 1919 میں ایک نیا دستور Weimer Constitution عمل میں آیا۔ اس دستور کی رو سے عورتوں کو ووٹ دینے کی اجازت ملی۔ اس وقت تک امریکی عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔ جرمنی کے ایک سال بعد انھوں نے ایک دستوری ترمیم کے ذریعہ یہ حق حاصل کیا۔

جس طرح عورتوں کی تعلیم پر پابندیاں تھیں، اسی طرح ان کے حقِ رائے دہندگی پر بھی اعتراضات ہونے لگے۔ حالاں کہ مردوں کو حاصل اس حقِ رائے دہندگی پر عورتیں سوال اُٹھا چکی تھیں اور Christiana Mariana Von Zieglar (1695-1760) نے اپنی ایک نظم میں اس پر طنزیہ انداز میں جملے بھی کسے تھے :

You say that fortunes favoured you
by making you some what complete
and in a wink you can construe
thoughts with which we can't compete
yet if we'd investigate your priviledge
you'd be found weaker by a measure.

موقعہ ملنا چاہیے۔اس نے عورتوں کے سماجی حالات پر روشنی ڈالنے کے لیے Fictitious خطوط کے انداز میں مضامین لکھے جن میں گھر کا کام کاج کرنے والی ملازماؤں کی دشواریوں کا احاطہ کیا گیا۔Third Estate for Women : Training for Domestic Servents (1863) میں وہ لکھتی ہے کہ نوکرانیوں کی مناسب تربیت ہونی چاہیے۔چودہ پندرہ سال کی کم سن لڑکیوں کو بار بار گھر بدلنے اور نوکری بدلنے کی وجہ سے کام میں دشواری ہوتی ہے۔ان کے لیے ہر جگہ مطابقت کرنا مشکل ثابت ہوتا ہے۔وہ گھر کے افراد سے پوری طرح مانوس ہو پاتی ہیں نہ ان کے مزاج کو سمجھ پاتی ہیں۔اس کا کہنا تھا کہ ایسی لڑکیوں کی مناسب ٹریننگ ہونی چاہیے۔ Ninth Easter Letter (1863) میں وہ ایسی متمول عورتوں پر تنقید کرتی ہے جو خود تو نوکرانیوں اور آیاؤں کے بل پر زندگی عیش میں گزارتی ہیں لیکن ان کی مشکلات پر نظر نہیں ڈالتیں۔

Adlheid Popp (1869-1939) نے بنیادی تعلیم تک حاصل نہیں کی تھی لیکن عورتوں کے حقوق کے متعلق اس نے بھی معلومات حاصل کر رکھی تھی اور ان کے حصول کے لیے جی جان سے کوشاں تھی۔اس نے عام جلسے میں تقریر کرنے کی ہمت بھی کی اور اس کی ساتھی Amalie Seidl نے ان ناگفتہ بہ حالات پر روشنی ڈالی جن کی وجہ سے کام کاج کرنے والی عورتوں کا پہلا اسٹرائیک 1912 میں ہوا۔عورتوں کی ترقی کی راہ میں باورچی خانے کو ایک رکاوٹ مانتے ہوئے چند لوگوں کے ذہن میں یہ تصور بھی آیا کہ ایک مشترکہ باورچی خانہ بنایا جائے۔Lily Braun (1885-1916) نے اپنے مضمون Women's Work and House Keeping (1901) میں تجاویز پیش کیں کہ مشترکہ باورچی خانہ کھانا پکانے اور پروسنے میں جو وقت صَرف ہوتا ہے اس کی بچت کر سکتا ہے لیکن یہ تجویز کارگر نہ ہو سکی۔وہ شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی پر سیاسی جدوجہد میں برابر کی شریک تھی اور بایاں-بورژوا خواتین تنظیم کی ممبر تھی۔اس نے بورژوا اور مزدور طبقوں کے بیچ مصالحت کی کوشش بھی کی تھی جس کی وجہ سے اس پر حملے بھی ہوئے۔وہ ایک اخبار کی ادارت بھی کرتی تھی۔Sussane Sahr نامی ایک صحافی نے "The Social Conditions of Female White Collor Workers" (1930) میں شہر کی باروزگار عورتوں کی تعداد میں اضافے کی طرف

بنتے ہیں اور پردوں پر کشیدہ کاری کرتے ہیں۔ وہ کہتی ہے :

See the lace makers sitting at their pillows
Their cheeks pale and their eyes red
All toiling for a bite
A bite of black bread

(جرمنی سے انگریزی Melanie Archangeli اور Patrieia A. Herminghouse)

For the Female Workers میں وہ ان خوش حال عورتوں سے ناراضگی کا اظہار کرتی ہے جو وقت گزاری کے لیے موزے بنتی ہیں اور کچھ بھی معاوضہ مل جانے پر مطمئن ہو جاتی ہیں۔ دراصل انہیں پیسوں کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن ان کی یہ حرکتیں عام عورتوں کے محنتانے پر اثر ڈال رہی ہیں۔ وہ عورتیں جو غریب ہیں اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں' ان کے لیے صورتِ حال تشویش ناک ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی عورتیں بڑے کاروباریوں کے لیے کم اُجرت پر کام کرنے کے لیے راضی ہو جاتی ہیں۔ نتیجتاً ان کا استحصال شروع ہو جاتا ہے۔ وہ عورتوں کو اپنا یونین بنانے پر زور دیتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ مرد' عورتوں کے مسائل پر الگ سے کچھ نہیں سوچتے۔ وہ اُسی وقت احتجاج کرتے ہیں جب ان کے ذاتی مفاد کو دھکا پہنچتا ہے۔ عورتوں کی خاطر وہ کوئی آواز نہیں اُٹھاتے۔

Luise Buchner (1821-1877) نے لڑکیوں کے والدین سے گزارش کی وہ اپنی بیٹیوں کے لیے بہترین طریقۂ تعلیم کا انتخاب کریں۔ ان کی دانشورانہ صلاحیتوں کو اُبھارنے میں مدد دیں اور میکینکل تعلیم کے بجائے نیچرل سائنس کی تعلیم دیں۔

Fanny Lewald (1811-89) نے "Treat us like men so that we can become competent women" (1870) میں لکھا کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ عورتوں کے لیے یونی ورسٹی کی تعلیم سے پہلے سکنڈری تعلیم کا بندوبست کرے۔ اس کا کہنا تھا کہ عورتوں کی اسکولی تعلیم بالکل پُرتصنع ہے۔ اس نے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک جیسے طریقۂ تعلیم پر زور دیا۔ Lewald نے امراً کے لیے الگ درس گاہوں کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ سبھوں کو اچھی تعلیم حاصل کرنے کا بھرپور

اُنیسویں صدی کے وسط میں Louise Otto Peters (1819-95) نے چودہ سالہ لڑکی کی مکمل تعلیم والے تصور پر کاری ضرب لگائی۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم ضروری ہے اور وہ اس لیے کہ بہتر سماج کی تشکیل ہو سکے۔ اس نے Participation of the Feminine Sphere in Affairs of the State (1847) میں تواریخ پڑھانے کے طریقے پر نکتہ چینیاں کیں اور چند اصلاحات بھی پیش کیں۔ اس کا کہنا تھا کہ سچی نسائیت ایک ایسی تعلیم کے سبب پروان چڑھتی ہے جو کسی عورت کو مرد کے ہاتھ بیوی کی حیثیت سے فروخت کیے بغیر' آزادانہ طور پر باوقار انداز میں جینے کا حوصلہ عطا کر سکے۔ 1876 میں اس کا ایک اور مضمون منظرِ عام پر آیا جس میں اس نے عورتوں کی تکنیکی تعلیم پر زور دیا۔ Hopes for the Future اور On Domestic Education of Girls میں وہ عورتوں کے تعلیمی نصاب میں تنوع کی حمایت کرتی ہے۔ اس نے نہ صرف تکنیکی تعلیم کی حمایت کی بلکہ اس طریقۂ تعلیم پر تنقید بھی کیا جو اسکولوں میں بچیوں کے کھیل کود کو گڑیا، گڑیا گھر اور برتن باسن تک محدود کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کے لیے بھی باغ بانی، پالتو جانوروں کی دیکھ ریکھ اور ایسے ہی دوسرے کام کاج سیکھنے ضروری ہیں تا کہ ان کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہو اور گھر کی چہار دیواری سے باہر بھی وہ اپنی صلاحیتیں منوا سکیں۔

جرمنی میں غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور وہ اس لیے کہ عورتیں اب کیریئر بنانے کی دُھن میں تھیں۔ انہوں نے معلّمی اور نرسنگ کو پیشے کے طور پر اپنانا شروع کیا۔ کل کارخانوں اور مِلوں میں بھی عورتیں مزدوری کرنے لگیں۔ بڑے بڑے دفاتر میں انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے بھی انہیں ملنے لگے۔ عام طور پر عورتوں کو بہت کم پیسے ملتے تھے اور معمولی اُجرت پر اُن سے ڈھیروں کام لیا جاتا تھا۔ Louise Otto Peters نے For the Female Workers (1849) میں عورتوں کے معاشی استحصال پر روشنی ڈالی اور حالات میں بہتری لانے کی تجاویز پیش کیں۔ اس نے ایسے اداروں کے قیام پر زور دیا جو عورتوں کے حقوق کی حمایت کر سکیں۔ اس نے اپنی نظم The Lace Makers (1851) میں گھر پر کام کرنے والی اُن عورتوں اور بچوں کی قابلِ رحم حالت کا ذکر کیا جو امیروں کی خاطر خوب صورت اور نفیس لیس (Lace) تیار کرتے ہیں' موزے

کی مخالفت کی جس کے تحت عورتوں کو عام انسان کے دائرے میں رکھ کر ان پر تعلیم کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ اس نے اپنے مضمون Education and the Instruction of Female Sex (1810) میں مردوں کے اس آمرانہ رویے کا پول کھولتے ہوئے کہا کہ عورتوں کے تئیں مردوں کا یہ سلوک انتہائی جارحانہ ہے۔ تعلیم کے فوائد کی طرف وہ اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ :

> ''گرچہ تعلیم کو عورتوں کے گھریلو کام کاج میں رکاوٹ کے طور پر دیکھا جا رہا ہے تاہم تعلیم ہی کسی عورت کو بہترین بیوی بننے میں مدد دے سکتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت کے تعلقات وسیع ہوتے ہیں۔ لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے رہنے سے اُسے گفتگو کے آداب آجاتے ہیں اور وہ انسانی نفسیات کو بھی سمجھنے لگتی ہے۔ یہ علم اسے رشتوں کی سمجھ اور انہیں نبھانے کا ہنر عطا کرتا ہے۔ گھر میں جھگڑے اسی وقت ہوتے ہیں جب آپسی رنجش اور غلط فہمیاں بڑھتی ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون گھر کے تمام افراد کی ضروریات کو سمجھتی ہے اور انہیں مطمئن رکھنا جانتی ہے۔ تعلیم انسان کی خود غرضیوں کو کم کرتی ہے اور انسان خود مرکزی ہونے کے بجائے لامرکزی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں مست رہنے کے بجائے دوسروں کے سکھ دکھ کی پرواہ کرنے لگتا ہے۔
>
> (جرمنی سے انگریزی Melanie Archangeli)

Louise Ditman (1807-84) نے Domestic Life (1848) میں کچھ تجاویز پیش کیں اس نے بتایا کہ گھر کی چہار دیواری میں دم توڑ دینے والے ہنر کو کس طرح بازار میں منافع کمانے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ Louise Aston (1814-71) کی طرزِ زندگی عام لڑکیوں سے بالکل الگ تھی۔ Banishment (1846) میں اس نے اس خوف کی طرف اشارہ کیا جو پرشین حکومت کو اس کے بے باک طرزِ عمل سے تھا۔ اس نے مردوں کے انداز میں زندگی گزاری۔ اس کے ملبوسات مردوں کے انداز کے ہوتے تھے۔ وہ شکار کی شوقین تھی اور مردوں سے دانشورانہ سطح پر گفتگو کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔

گانے، حساب بنانے اور لاطینی بولنے کا موقعہ ملتا رہے گا۔ میں اپنی زبان میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ سکوں گی اور میرے شوہر کو بھی اس بات سے مسرت حاصل ہوگی کہ روم سے متعلق کوئی نہ کوئی کتاب میرے مطالعے میں شامل ہے۔"

اٹھارہویں صدی کے وسط میں چند ہی عورتیں یونی ورسٹی کی تعلیم پر مائل تھیں۔ پہلی جرمن ڈاکٹر Dorothea Christaine Leoporin(1715-62) نے اپنے ایک مضمون میں ان وجوہات کا غائر مطالعہ پیش کیا جن کی بنیادوں پر عورت کے لیے یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس مضمون کے ذریعہ وہ ساری عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتی نہ ہی کیریئر بنانے کی تجویز دے رہی ہے بلکہ وہ اس رواج کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی ہے جو عورتوں کو گھریلو تعلیم تک پابند رکھنے کے درپے ہے۔

Amolie Holst (1758-1829) نے جنس کی بنیادوں پر عورت اور مرد کے لیے الگ الگ نصابِ تعلیم کی مخالفت کی۔ اس نے مردوں کے اس متعصبانہ نظریے کو سختی سے رَدّ کیا کہ عورتوں کی جسمانی اور دماغی ساخت اسے تعلیمی سرگرمیوں سے دور رکھنے کا سبب بنتی ہے۔ Women's Obligation Towards the Higher Cultivation of Mind (1802) میں اس نے صاف کہا ہے کہ یہ عالمِ انسانیت کی آدھی آبادی کو جاہل رکھنے کی بدترین کوشش ہے۔ وہ اپنے مضمون میں کئی طرح کے سوال اُٹھاتی ہے اور پھر جواب بھی فراہم کرتی ہے :

> "Do we exist simply for men? This question seems laughable when one birngs it before the court of common sense. Common sense tells us that both sexes exist to promote the happiness of one another, so that, united in the most splendid union, they are able to cultivate in themselves the highest ideal of humanity and act for the best of the whole. (Tr. Melanie Archangeli)

Betty Glein (1781-1927) نے نسائیت کے ابہام کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا اور اس تعصب

نے ان خطوط کو نظم کی شکل عطا کر دی۔ یہ خطوط یا نظمیں عورتوں کے لیے گھریلو کام کاج تک محدود طریقۂ تعلیم کے خلاف تھیں۔ وہ لکھتی ہے کہ :

To cook and spin for a man

An unworthy profession

Be it the one for which nature made me

With these senses and with this spirit

اس نظم میں (1777) خانہ داری کو قدرت کی طرف سے عطا کردہ ذمہ داری مانتے ہوئے بھی ایک طرح کی بے زاری کا احساس ملتا ہے۔ وہ ایک مرد کے لیے کھانا پکانے اور سینے پرونے کے کام کو 'Unworthy' مانتی ہے۔

اُسی دوران Dorothea Von Sclozer اپنی سہیلی Luise Michasels کو ایک خط میں لکھتی ہے کہ :

''کیا ایک عورت کو اپنے خاوند کو خوش رکھنے کے واسطے صرف پکانے اور سینے پرونے کا کام کرنا چاہیے..... ہا.....تب تو مجھے کسی کے یہاں باورچن یا درزن کی حیثیت سے نوکری پکڑ لینی چاہیے تا کہ کم از کم مجھے ایک ایسے شخص کے چنگل سے نکل بھاگنے کی پوری آزادی رہے..... میری شادی اگر کسی بزنس مین یا صنعت کار سے ہوگئی تو کیا ہوگا؟ اسپین، فرانس، ہالینڈ، اٹلی، انگلینڈ، سوئیڈن وغیرہ سے اس کے کاروباری تعلقات رہیں گے اور مجھے اس کے لیے مکتوب نگاری کرنی پڑے گی۔ وہ ایک منشی کی تنخواہ دینے سے بچ جائے گا۔ تو کیا اُس پیسے سے وہ میرے لیے ایک نوکر نہیں رکھے گا؟ ہم لڑکیوں کو شوہروں کا انتخاب کرنے کی اجازت کہاں ہے۔ نہ تمہیں نہ مجھے۔ اگر میری کسی اسکالر سے شادی ہوگئی تو میری پڑھائی لکھائی کا کچھ نقصان تو ضرور ہوگا تاہم یہ شادی بہت تکلیف دہ نہ ہوگی۔ گھر کے کام کاج کے علاوہ کم از کم مجھے پیانو بجانے' گانا

پابندی عائد کردی گئی اور ان کی سیاسی جدو جہد کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ چوں کہ ٹریڈ یونین اس زمرے میں نہیں آتے تھے' اس لیے 1890 کے بعد ٹریڈ یونینوں میں عورتوں کی تعداد بڑھنے لگی اور Socialist Workers Party گرچہ 1875 سے ہی فعال تھی لیکن عورتوں کو ممبر بنانے کی بات انھوں نے بہت بعد میں سوچی۔ اس کے بعد عورتوں نے اپنی میٹنگیں شروع کیں اور انکی سیاسی و سماجی بصیرت میں اضافہ ہوا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح جرمنی میں بھی عورتوں کے متعلق کم و بیش یہی تصور عام تھا کہ عورت مرد کی جاگیر ہے' بچہ پیدا کرنے کی مشین ہے' مرد سے الگ ہے' کم تر ہے' کمزور ہے وغیرہ وغیرہ۔ تعلیمِ نسواں چند طبقوں تک محدود تھی اور عام عورتوں میں اس کی ضرورت محسوس بھی کی گئی تو اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں۔ انگلینڈ' سوئٹزرلینڈ اور امریکا کے مقابلے میں جرمنی کے پیچھے رہنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ جرمنی 1871 تک متحد نہ ہوسکا تھا۔ نسائی تحریک کی شروعات سے قبل بورژوا سماج میں لڑکی کی تعلیم کا مطلب تھا گھریلو کام کاج میں سگھڑ ہونا۔ اس کی قابلیت کا اندازہ ان باتوں سے لگایا جاتا تھا کہ وہ ایک ماں اور بیوی کی حیثیت سے اپنے فرائض پوری تن دہی سے انجام دے رہی ہے یا نہیں۔ اسے کھانا پکانے' سینے پرونے کی مشق ہے یا نہیں' نوکروں سے کام لینا وہ جانتی ہے یا نہیں۔ بعد ازاں اس کی مہارتوں میں پیانو بجانا' ناچنا گانا اور شعر پڑھنا شامل ہوا۔ صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد تعلیمی نصاب میں تبدیلیاں آئیں اور عورت کے بدلتے ہوئے تصور کے ساتھ عورت کے لیے بدلے ہوئے نصاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ حالاں کہ یہاں بھی طبقاتی فرق نمایاں رہا۔ مثلاً بورژوا خاندان کی لڑکیوں کے لیے ایسے سوالات ترتیب دیئے جاتے تھے جس سے تعلیم میں خرچ کی گئی رقم کے بدلے خاندان اور سماج کو حاصل ہونے والے فائدے کا حساب کیا جاتا تھا۔

ابتداً کچھ عورتوں نے جنس کی بنیادوں پر طے پانے والے نصاب سے انحراف کیا۔ ان میں ایک Nantchen Gockingk (1743-81) عرف Vopel بھی ہے جس نے اپنے شوہر Leopold Friedrick Gunther Von Gockingk کے نام کئی خطوط لکھے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس کے شوہر

تھی۔ کم اُجرت اور بعض اوقات چھنٹائی کے بعد پیش آنے والی غربت سے گھبرا کر اکثر عورتیں جسم فروشی پر مائل ہونے لگیں۔ ۱۹ ویں صدی کے دوسرے نصف میں حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ برلن میں ہی تقریباً 1600 جسم فروش عورتیں تھیں۔ 1909 تک ان کی تعداد 40,000 ہوگئی تھی۔ سرِ عام ان کی جسم فروشی سے گھبرا کر حکومت نے ان عورتوں کے لیے شناختی کارڈ مقرر کیے تاکہ انھیں سڑک پر چلنے والی دوسری شریف عورتوں سے متمائز کیا جاسکے۔ گرچہ یہ طریقہ ایک طرح کی طبقاتی درجہ بندی کو ہوا دیتا تھا، تاہم سماج میں اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ ایک مرد کو تو عیاشیوں کی پوری آزادی تھی لیکن ایک عورت کو شادی سے پہلے جسمانی تعلقات قائم کرنے کی کوئی اجازت نہیں تھی بلکہ اسے تو جنسی خواہش کے اظہار کی بھی آزادی نہیں تھی۔ ہوٹلوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو ''مالِ مفت'' سمجھ کر جنسی طور پر پریشان کیا جاتا تھا لیکن اعلیٰ طبقہ کی عورتوں پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سوچنا پڑتا تھا۔ غرض جنسیت کے متعلق یہ دوطرح کے پیمانے اور وہ بھی طبقاتی فرق کو ملحوظ رکھ کر، جرمن سوسائٹی کی خاص پہچان تھی۔

1888 میں عورتوں کی مزید انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں نے عورتوں کی آزادی اور اعلیٰ تعلیم کی بھرپور حمایت کی۔ یہ انجمنیں مقصد تو ایک ہی رکھتی تھیں، یعنی عورتوں کی آزادی، ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کے لیے اعلیٰ تعلیم کا بندوبست۔ تاہم نظریاتی اعتبار سے ان میں کچھ اختلافات برقرار تھے۔ مثلاً بورژوا عورتوں کی پرولتاری عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی سعی کے باوجود مزدور عورتوں کی انجمن ''سوشل ڈیموکریٹک ایسوسی ایشن'' (SDA) بورژوا عورتوں کی تحریک سے الگ چل رہی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا کہ بورژوا سوسائٹیاں مزدور عورتوں کو صرف سماجی پالیسی اور فلاح کے نام پر استعمال کررہی ہیں۔ مزدوروں کی سچی ترقی میں کوئی یقین نہیں رکھتا۔ اپنے مطالبات منوانے کے لیے پرولتاری عورتوں نے مردوں کی انجمنوں کے انداز پر اپنی انجمنیں تشکیل دیں اور یونین قائم کرکے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے آواز اُٹھائی۔ مڈل کلاس عورتوں کی طرف سے جب عام عورتوں کے لیے بہتر محنتانہ اور مناسب مزدوری کے لیے تحریک چلائی گئی تو سوشل ڈیموکریٹک پر ''سوشلسٹ مخالف'' (Anti Socialist) قانون کے تحت

جو Emancipation کے نظریئے کو ہی رَدّ کرتی تھیں۔ Otto خود کو Emancipation کی حمایتی ماننے سے انکار کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ عورتوں کے مرد سے مختلف ہونے کی حقیقت کو تسلیم کرتی ہے اور وہ اس لیے کہ عورتیں انہی خصوصیات کی بنا پر مردوں سے الگ مانی جاتی ہیں۔ عورتوں کی نسائی خصوصیات سے انکار، ان کے جنسی خائص سے انکار ہے جو قدرت نے ان کو ودیعت کی ہیں۔ وہ عورتوں کا اپنے گھر اور سماج میں ایک ترقی یافتہ اور بھرپور نسائی شخصیت کی حیثیت سے اُبھرنے میں یقین رکھتی تھی۔

بورژوا سوسائٹیوں نے سماجی سطح پر بھی سوچنا شروع کیا اور مل مزدوروں اور غریب دستکاروں و صناعوں کے لیے فلاحی ادارے قائم ہوئے۔ برلن میں Women's Association for the Relief of Need نے چھوٹے کارخانہ داروں کے لیے فنڈ اکٹھا کیا تا کہ وہ اپنے کاروبار کو بڑھا سکیں۔ انہوں نے کم اُجرت پر کام کرنے والی مزدور عورتوں کے حقوق کی لڑائی بھی چھیڑی۔ 1949 میں برلن میں Democratic Women's Association نے نیشنل اسمبلی میں غریب عورتوں کی طرف سے ایک عرضی داخل کی۔ اس نے اپنے ممبروں سے یہ بھی گزارش کی کہ وہ صرف ملکی سامان سے تیار کپڑے استعمال کریں۔ اس طرح سے ایک بہناپے نے جنم لیا اور عورتیں' عورتوں کی حفاظت میں لگ گئیں۔ حالاں کہ دیکھا جائے تو ہر درجہ وطبقہ کی عورتوں کے حالات ایک دوسرے سے کچھ بہت مختلف نہ تھے۔ مثلاً بورژوا عورتوں کو نوکری کرنے کی اجازت نہیں تھی جب کہ پرولتاری عورتیں کام نہ کرتیں تو بھوکوں مرجاتیں۔ طبقاتی طور پر اعلیٰ وادنیٰ کے زمروں میں بٹے ہونے کے باوجود یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ برقرار تھی کہ سبھی عورتوں کو سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے اور وہ اپنی اپنی زندگیاں اپنے شوہروں کے بنائے ہوئے اُصولوں کے مطابق گزارتی تھیں۔ اپنے حقوق کی لڑائی لڑنے کے لیے دونوں کو ایک ہی طرح کے مسائل پر غور وخوض کرنے کی ضرورت تھی۔ جرمنی میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہونے لگا۔ کپڑا کاتنے اور بننے کی ملوں اور لانڈری وغیرہ میں عورتوں کی کھپت زیادہ تھی۔ 1860 کے آس پاس ۵۵ رفیصد عورتیں فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرتی تھیں جب کہ 1900 کے آس پاس ان کی تعداد ۷۰ رفیصد

وتقریر کی آزادی بہرحال دی گئی۔ لوکل جرمن کیتھولک کمیونٹی نے Women's Educational Association کی بنیاد ڈالی جس نے 1850 میں عورتوں کے لیے ایک یونیورسٹی بھی کھولی۔ Carl Frobel نے جو "فادر آف کنڈر گارٹن" کے نام سے جانا جاتا ہے، لڑکیوں کے لیے ایک علیحدہ تربیتی اسکول کھولا تاکہ انہیں تعلیم اور خانہ داری سے متعلق مناسب معلومات حاصل ہوسکیں اور بعدازاں وہ گورنس یا نرسری اسکول کی ٹیچر کی حیثیت سے کام کرسکیں۔ وہ تمام سیاسی ادارے جن کی ممبرشپ صرف مردوں کے لیے مخصوص تھی، عورتوں کے لیے بھی وا کر دیئے گئے۔ Frankfurt Paul Kirche جہاں مردوں کے ذریعہ منتخب شدہ پہلی پارلیمنٹ (اپریل-مئی 1848) بیٹھی تھی، دوسو سیٹیں عورتوں کے لیے پلیٹ فارم پر مخصوص کردی گئی تھیں اور ان کی ٹکٹیں بھی بڑی تیزی سے بکی تھیں۔ غرض 1848 میں عورتوں کی تحریک نے زور پکڑا اور عورتوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی مانگ شروع ہوئی۔ بچوں کی پرورش اور پرداخت کرنے والی عورتوں کے لیے باہر کی دنیا سے واقفیت اس لیے بھی ضروری تھی کہ وہ اپنے بچوں کو ذمہ دار شہری بنانے میں کامیاب ہوسکیں۔

Louise Otto نے Frauen-Zeitung(1849) میں لکھا ہے کہ "ہمیں ہماری قوتوں کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ قوتیں خالصتاً انسانی ہیں اور ہمیں ذمہ دار اور خوداختیار شہری بننے کا پورا حق حاصل ہونا چاہیے۔"

غیرشادی شدہ عورتوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ان کے لیے بہترین تعلیم لازمی قرار دی گئی تاکہ وہ کسی فن میں مہارت حاصل کرکے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکیں اور خودکفیل کہلائیں۔ 1860 کے بعد لڑکیوں کے لیے الگ تربیتی اسکول کھولے گئے جہاں وہ کوئی کام سیکھ کر اپنا کاروبار شروع کرسکتی تھیں۔ درس وتدریس عورتوں کے لیے سب سے مہذب پیشہ ٹھہرا اور پرائمری اسکولوں میں عورتوں کی بحالی کا کام شروع ہوا۔ اسی دوران عورتوں کی آزادی یا Emancipation کو لے کر خود عورتوں کے درمیان دو طرح کے نظریات پرورش پانے لگے۔ ایک طرف Louise Aston اور George Sand جیسی عورتیں تھیں جو مردوں کا لباس، ان کا رہن سہن اور عادات واطوار اپنا کر ان کی برابری کرنے کو ہی Emancipation مانتی تھیں جب کہ دوسری طرف Louise Otto جیسی عورتیں تھیں

CALCUTTA CENTRAL LIBRARY

طور پر زندگی گزارنے کا رجحان بڑھا۔

Fanny Lewald (1811-1889) اور Malivda Von Meysenbug (1816-1903) نے اپنے والدین کی پسند سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ Johana Kinkel (1810-1858) اور Mathilda Franziska Annneke (1817-1884) نے ایسے شوہروں سے طلاق لے لی جنہیں وہ پسند نہیں کرتی تھیں اور نئے رشتے قائم کیے جو ان کے لیے ذہنی تسکین کا باعث اور ادبی و ثقافتی اعمال وافکار میں مددگار ثابت ہوئے۔

1848 میں عورتوں کی پہلی تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا۔ بورژوا' جو سماج میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور معاشیات پر حاوی تھے' پریس اور دوسرے اداروں کی آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔ انھوں نے پارلیمانی حکومت اور جمہوری عدلیہ کا مقابلہ کیا۔ وہ ملک چلانے کے لیے ایک دستور کی تشکیل پر زور دے رہے تھے۔ اس مطالبے میں ملک کا ہر امیر و غریب شریک تھا۔ لوگوں میں سیاسی بیداری بڑھنے لگی اور سبھی عملی طور پر سیاست میں حصہ لینے لگے۔ غریب مزدوروں اور کسانوں نے فنڈ اکٹھا کیے اور اپنے طبقے کی سماجی و معاشی بہتری کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ جب 1848 میں رونما ہونے والے انقلاب کی خبر جرمنی پہنچی تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور سبھوں نے علاقائی انتظامیہ کو عرض داشتیں دینا شروع کر دیں۔ برلن میں اجتہادیوں اور ملٹری کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ پریس، سیاسی ادارے اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کی وجہ سے انفرادی طور پر مختلف انجمنیں قائم ہوئیں اور عوامی مطالبات کی فہرست مرتب کرنے لگیں۔ انہی حالات میں عورتوں نے بھی اپنی آواز بلند کی۔ یوں بھی برسوں سے عورت تخلیق کاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ نسائی حقوق کی بات چھیڑ رکھی تھی۔ اب وہ کھل کر میدان میں اُتر آئیں۔ انہوں نے عورتوں کی علیحدہ انجمن کی مانگ کی۔ چرچ کے ذریعہ چلائی گئی تحریکات میں بھی عورتیں دلچسپی لے رہی تھیں۔ مثلاً جرمن کیتھولک (Deutch-Katholiken) جنہوں نے Papism کے خلاف آواز بلند کی تھی یا پھر Lichte Freunde (Friends of Light) اور Freie Gemeinde (Free Communities) جنہوں نے آزاد اور Rational پروٹسٹنٹ ازم اختیار کیا۔ عورتوں کو بھی بہت معمولی طور پر لیکن تحریر

نظریئے سے بھی اختلاف رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شادی ایک ''اخلاقی رشتہ'' ہے۔ فلاسفروں کے علاوہ ماہرِ دینیات نے بھی اس نظریئے کی حمایت کی اور 1840 کے بعد پرشیا کی حکومت نے طلاق کے لیے کڑی شرطیں مقرر کیں۔ اس دوران مردوں کے ساتھ خصوصی رعایت برتی گئی۔ مردوں کو زنا کاری کی اجازت تھی لیکن عورتیں اس گناہ کی مرتکب نہیں ہوسکتی تھیں۔ چوں کہ عورتوں کا وجود گھر کی چہار دیواری تک محدود تھا' اس لیے گھر کی نگہداشت انہی کا کام تھا۔ شوہر کے علاوہ کسی اور سے تعلق قائم کرنا یا طلاق لینا' گھر کی تباہی کا باعث بن سکتا تھا۔ مردوں کے متعلق عام تصوّر یہ تھا کہ وہ گھر کے باہر کی دنیا میں اُلجھے رہتے ہیں اور ان کا کام عورتوں کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے' اس لیے گھر کو جنت بنائے رکھنے کی ذمہ داری عورت کی ہے۔ متوسط طبقے کا مرد جتنا زیادہ کیریئر کے بارے میں سوچنے لگا' اتنا ہی عورتوں کی گھریلو ذمہ داریاں بڑھنے لگیں۔

بورژوا سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کے درمیان اس تفریق کے دور کو Biedermeir دور کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح 1850 کے بعد سے استعمال ہونے لگی۔ اس کا مقصد Restoration Era میں بورژوا طرزِ زندگی کا مذاق اُڑانا تھا۔ کہتے ہیں بورژواؤں نے جب جب متوسط طبقے کی آزاد خیالی پر پانی پھرتے دیکھا اور سیاست میں شرکت کے امکانات دھندلاتے نظر آئے تو انہوں نے گھر کی محفوظ فضا میں رہنے کو ترجیح دی۔ بیوی اور بچوں سے وفاداری کی توقع اس نفسیاتی اُلجھن کی دین تھی جو سیاست میں بے عملی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ تمام تر سختیوں کے باوجود گھر کے باہر کی دنیا میں بھی متوسط طبقے کی جرمن عورتیں سرگرمِ عمل رہیں' چاہے وہ Hambach کا تہوار ہو یا جنگ کا میدان۔ زخمیوں کی تیمارداری ہو یا غریب عورتوں کو ہاتھ کا کام سکھانے کی ذمہ داری۔ مردوں اور عورتوں کے سماجی کاموں میں فرق تھا تو اتنا کہ مرد سماج میں اپنی پہچان بڑھانے اور علاقائی انتظامیہ میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کے لیے سماجی خدمات انجام دیتے تھے جبکہ عورتوں کی سماجی کارگزاریوں کو Labour of Love کا نام دیا جاتا تھا انہیں اس کا کوئی معاوضہ یا صلہ نہیں ملتا تھا۔ 1840 کے آس پاس عورتوں نے ان کاموں کو پیشے کے طور پر اپنانا چاہا جنہیں عموماً نسائی کام گردانا گیا تھا۔ مثلاً درس و تدریس، تیمارداری، علاج معالجہ اور فلاحِ عام۔ عورتوں میں آزادانہ

کھل کر اظہار کیا۔ کچھ دنوں تک پرشیا کی فوج نے اسے اپنی قید میں رکھا۔ اس نے فریڈرک شلیگل کو اپنے خیالات سے بے حد متاثر کیا اور اس کے بھائی سے شادی کر لی۔ دونوں نے ساتھ مل کر شیکسپیئر کا ترجمہ کیا اور Jena کے رومانی حلقے میں خاصی دھوم مچائی۔ اس کے بعد فلسفے کے ایک پروفیسر شلنگ کی محبت میں گرفتار ہوگئی جو عمر میں اس سے بارہ سال چھوٹا تھا۔ اس نے 1803 میں شلیگل سے طلاق لے کر شلنگ سے شادی کر لی۔ ایک بے انتہا آزاد زندگی گزارنے کے باوجود وہ عورتوں کا فرض شناس رہنا ضروری سمجھتی تھی اور اُصولوں کی خلاف ورزی کرنے والیوں کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کی رفیق و رقیب Dorothea نے جو نشاۃ الثانیہ کے علم بردار Moses Mandelssohn کی بیٹی تھی' اپنے خاوند سے طلاق لے لی اور شلیگل کے ساتھ شادی کیے بغیر رہنے لگی۔ اس دور میں شادی کے بغیر کسی کے ساتھ رہنا سہنا اور زندگی گزارنا بڑی ہمت کا کام تھا۔ Dorothea خود بھی تخلیق کار تھی اور اپنے رائلٹی کے پیسوں سے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ برسوں ساتھ رہنے کے بعد اس نے بالآخر 1804 میں شلیگل سے شادی کر لی۔ گرچہ آخر میں اس نے شلیگل سے بھی طلاق لے لی' تاہم جب تک وہ اس کے ساتھ رہی' اسے اپنا آقا و خاوند مانتی رہی اور ساری زندگی ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے فرائض بڑی تندہی سے نبھاتی رہی۔ اس نے لکھا ہے :

"Women can be made unhappy by the unreasonable rule of men but without this rule they are, without exception, lost for ever."

جب رومان پسندی کا طوفان تھما تو عورت اور مرد کے رشتے کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوشش شروع ہوئی۔ نپولین کی فوج کے جرمنی پر قابض ہونے کے بعد اہلِ جرمنی کو نئے قومی تشخص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب تاج سے وفاداری، سچا عیسائی اور سچا جرمن ہونا زیادہ ضروری تھا' بہ نسبت رومان پسندوں کی طرح آئیڈل اور بھرپور شخصیت کے روپ میں اُبھرنے کے۔ عورتوں اور مردوں کی درمیانی خلیج اور گہری کی گئی نیز ان کے لیے الگ الگ ضابطے مقرر ہوئے۔ 1820 میں ہیگل نے کانٹ کے اس رویئے کی پُرزور مخالفت کی کہ شادی Reciprocal Use (استعمالِ باہمی) کے لیے ایک سمجھوتہ ہے۔ وہ رومان پسندوں کی دیوانی، محبت اور شادی کے

ناپید تھا۔ 1735 میں پہلی بار Zedler کی ایک جرمن لغت میں Familia کا لفظ ملتا ہے جو قدیم روم کے سماجی اور نسلی واحدے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جرمن اسی کو 'Haus' یعنی House hold کہتے تھے۔ یہ House ایک Haus vater یعنی ہاؤس فادر یعنی باپ اور ایک Haus matter یعنی ہاؤس مدر یا ماں کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔

فیملی کا مطلب صرف خاندان کے افراد ہی نہیں تھے بلکہ نوکر چاکر اور دوسرے رشتہ دار بھی تھے۔ مثلاً ایک کسان کا خاندان والدین، بیوی، بچوں، کھیت، مزدوروں اور دوسرے نوکروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ۱۸ ویں صدی کے دوسرے نصف میں بورژوا شاہانہ تہذیب کے نظریۂ نسائیت سے دور ہوتے گئے۔ ان نئے بورژواؤں نے جہاں ایک طرف شاہانہ زندگی بسر کرنے والی عورتوں کو رد کیا وہاں نچلے طبقے کی عورتوں کو بھی رد کر دیا۔ یہاں تک کہ شہر کے قدیم متوسط طبقہ مثلاً صناعوں، دست کاروں، سرائے کے مالکوں کی عورتیں بھی ان کے نسائی معیار سے خارج کر دی گئیں۔ وہ عورتوں کا باہر نکلنا قطعی ناپسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک عورتوں کا کام گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور زیادہ سے زیادہ محفلوں میں ناچنے تک محدود تھا۔ بورژوا سماج کے مردوں کو ہر معاملے میں کھلی چھوٹ تھی لیکن عورتوں کی آزادی سلب کر لی گئی تھی۔ وہ عورتوں کو اپنی جاگیر سمجھتے تھے اور اس پر پوری طرح قابض رہنا چاہتے تھے۔

تمام تر سختیوں کے باوجود مردوں کے بنائے ہوئے اُصولوں سے انحراف کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً Sophie La Roche متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی وہ پہلی عورت ہے جس نے اپنی تخلیقات کو شائع کروایا۔ وہ مردوں سے کھلے عام ملتی تھی اور تبادلۂ خیال بھی کرتی تھی لیکن آزادیٔ نسواں کی حمایتی ہونے کے باوجود اختیارِ کُل کی قائل نہ تھی۔ وہ اپنا خرچ خود اُٹھاتی تھی مگر شوہر کی آمدنی خرچ کرنے سے پہلے اس سے پوچھ لیا کرتی تھی۔ اسے ایک سگھڑ بیوی ہونے پر ناز تھا' جسے پکانے میں مہارت حاصل تھی اور جو نوکروں سے بخوبی کام لے سکتی تھی۔ اس طرح کے دوہرے کردار رکھنے والی عورتوں میں ایک نام Caroline (1763-1809) کا بھی ہے جس نے اپنے شوہر اور بچوں کی وفات کے بعد ایک آزادانہ زندگی بسر کی۔ اس نے اپنے ری پبلکن نظریات کا

اور خود کو ریاست کے جبر سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ عورتیں مرد کے جبر سے آزاد زندگی نہیں گزار سکتیں؟ کیوں انھیں ذمہ دار شہری کا درجہ نہیں دیا جا سکتا؟

اس کے بعد ایک فرانسیسی عورت Olympe Mariede Gouges نے پیرس نیشنل اسمبلی میں ایک عرض داشت Declaration of the rights of the women and citizens پیش کی اور ٹھیک اسی ڈھنگ سے بحث کی جیسی Hippel نے کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ 1789 کا انسانی حقوق کا Declaration ادھورا ہے' اس لیے کہ اس میں عورتوں کی آزادی اور ان کے مفاد کی بات شامل نہیں ہے۔ 1789 میں Olympe کو سزا ہوئی اور اس کے بعد عورتوں کی تنظیموں پر پابندی عائد کر دی گئی نیز عورتوں کے اجتماع کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ Hippel ان معنوں میں خوش قسمت تھا کہ وہ سزا پانے سے بچ گیا۔ اس کے خیالات نے گرچہ کچھ لوگوں کو متاثر کیا' تاہم وہ لوگ جو اس کی نشاۃ الثانیہ کی Absolutist order of the Estates والی تنقید کو صحیح مانتے تھے' عورتوں کے سوال پر چپ سادھ لیتے تھے۔ انہوں نے امرأ کے خلاف آواز اُٹھائی' طبقاتی درجہ بندی سے اختلاف کیا اور ریاست کی سخت گیری پر شدید نکتہ چینی کی۔ انہیں آزادی' برابری' ترقی اور مقابلے کی دُھن تھی۔ وہ انسانی آزادی کے اس لیے خواہش مند تھے کہ ریاست کی سخت گیری سے نجات انھیں معاشیات' تہذیب اور سماجی اتحاد و اتفاق کی بلندیوں پر لے جا سکتی تھی۔ لیکن ترقی اور آزادی کے اس کشادہ نظریئے میں عورتوں کی کوئی جگہ نہ تھی۔ نشاۃ الثانیہ کے دور میں ترقی' آزادی اور خوش حالی کا تصور صرف مردوں سے جُڑا تھا۔

Adlof Von Knigge جو ایک سیول افسر تھا اور 1788 میں نشاۃ الثانیہ کا زبردست حامی' عورتوں کو انسان ماننے پر ہی رضامند نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''بورژوا عوامی حلقے میں عورت کو اس حد تک الگ تھلگ رہنا چاہیے جس حد تک کہ وہ روزگار کے میدان سے دور ہیں اور سیاست میں شرکت کا تو کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ عورتوں کا اصل ٹھکانہ باورچی خانہ ہے یا پھر ۱۸ ویں صدی تک جو سمجھا جاتا رہا ہے' یعنی ''خاندان''۔

۱۸ ویں صدی کے پہلے نصف میں فیملی (Familie) کا لفظ جرمن بولنے والوں کے بیچ تقریباً

ڈاکٹر شہناز نبی
صدر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی

فیمینزم ـــــ جرمنی میں

1972 میں Theodor Von Hippel نے جو Konigsberg کا سیول افسر تھا' ایک کتاب شائع کی۔ یہ کتاب Uber die burger-liche Verbesse rung der weiber کے نام سے چھپی جس کے معنی ہیں The Civil advancement of women۔ اس کتاب میں اس نے لکھا کہ وہ شہری اور انسانی حقوق جسے مرد صرف اپنی جاگیر سمجھتے ہیں' عورتوں کو بھی ملنے چاہئیں۔ اس نے مردوں سے درخواست کی کہ وہ عورتوں کو محکوم بنا کر رکھنے کی عادت چھوڑ دیں۔ وہ کہتا ہے کہ اب جب گھر کی چھتوں پر سے چیخ کر انسانی حقوق کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے' عورتوں کو بھی ان کے حقوق کے دائرے میں شہری تسلیم کر لینا چاہیے اور انھیں اپنی طرح سوچنے اور اپنی کوششوں کے بل پر کچھ کر گزرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ Hippel اپنے وقت کا ایک روشن دماغ شخص تھا۔ وہ اپنے دور کے بے لچک نظام میں تبدیلی لانا چاہتا تھا اور آزاد شہریوں کے لیے ایک دستوری اور شہری سماج کا خواہش مند تھا۔ اس کے خیالات نے تنگ نظر متوسط طبقہ کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور پورے سماج میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر شہری اپنے فطری حقوق پر اصرار کرتے ہیں

جس کے سائے اپنے جیسے تھے
وہاں جھرنا بھی تھا اک
جس کی موسیقی پہ گائے ناچتے
ہم کھوسے جاتے تھے

سبھی کچھ یاد ہے ان منظروں کو
ہم ہی شاید بھول بیٹھے سب
چلو اچھا ہوا
یہ قصہ شاید اپنے اختتامی مرحلے پر ہے
مگر
غزالاں تم تو واقف ہو
کہ وہ دن کتنے اچھے
اور کتنے خوب صورت تھے

☆☆☆☆☆

حیدر صفت
لیکچرار، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی

غزالاں تم تو واقف ہو ——

مری صحرا نوردی
اور میری آبلہ پائی کا مجھ سے کیا علاقہ ہے
مرے ہونٹوں کی خاموشی
مری آنکھوں کی ویرانی
کے قصّے کیا نہیں کہتے

یہ کیسی دھند ہے
جو کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا
یہ کیسا شور ہے
کہ کچھ سنائی بھی نہیں دیتا
وہاں اک پیڑ تھا نا

G165781

مجھے گورے ہاتھوں نے غلامی کی کھونٹی پر
کلنڈر کی طرح ٹانگا تھا
کالے ہاتھوں نے آزادی کی صلیب پر
فرق صرف ہاتھوں کا ہے
میں کلنڈر کی طرح جب بھی صلیب پر تھا
میں کلنڈر کی طرح اب بھی صلیب پر ہوں
میں ۵۵ کیلوں پر ٹنگا ہوا آدمی
جشن خوش فہمی و خود فریبی میں شرکت سے انکار کرتا ہوں
مجھے تمہاری دعوت منظور نہیں!

☆☆☆☆☆

شمیم انور

ریڈر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی

۵۵ رکیلوں پر ٹنگا ہوا آدمی ——

مجھے تمہاری دعوت منظور نہیں
کیوں کہ خوش فہمی اور خود فریبی کے جشن کا مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے
زندگی کی ریکھاؤں کے درمیاں
جس سمندر میں مجھے قید کیا گیا ہے
وہاں —— چاروں طرف پانی ہوتے ہوئے بھی
میں —— برسوں سے پیاسا ہوں
گناہ کی لذت سے نا آشنا
—— عبادت کی سزا کاٹنے والوں کو
صرف ماتم کرنا آتا ہے
اپنے غم کے آنسو پر
تمہارے پیار کی ہزار مسکراہٹیں قربان کر سکتا ہوں

ترجمہ :

رہ ہونا ہموار یا ہموار ہے محو خرام
پشت کی جانب نہیں وہ دیکھتی ہے گھوم کر
غزلیں گاتی رہتی ہے تنہائی میں وہ صبح و شام
جو ہوا میں مل کے پیدا کرتی ہے دل پر اثر

اسی طرح بدرلزماں بدرؔ کلکتوی نے دوسری نظموں کے تراجم میں بھی اپنی ماہرانہ چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے اور ایک اعلیٰ درجہ کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ کیونکہ اعلیٰ درجہ کے ترجمے میں شاعر ''مرکزی خیال یا جذبے کا امین اور عکاس ہوتا ہے۔ اس کی زبان تکنیک' اسلوب اور ہئیت موضوع و مواد کے مطابق ہوتا ہے'' اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو نظموں کے ترجمے میں زبردست کامیابی ہوئی ہے اور یہ کامیابی صرف اس لیے نصیب ہوئی کہ بقول آل احمد سرور :

''مترجم کا کام ..... صرف اصل زبان سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہیے' اسے اس زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔''

(تراجم اور اصلاح سازی کے مسائل، صفحہ:۵۳)

ظاہر ہے بدرؔ کلکتوی کو صرف انگریزی زبان سے واقفیت ہی نہیں تھی بلکہ انگریزی ''معاشرے اور تہذیب'' سے کماحقہ آشنا بھی تھے۔ انگریزوں سے ان کی بڑھتی ہوئی دوستی اس بات کا ثبوت ہے۔

☆☆☆☆

"بدرالزماں بدؔر صاحب کی مندرجہ بالا نظم کا لطف اٹھانے کے بعد ناظرین انکی اس دوسری معجز نمائی کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں انہوں نے ورڈس ورتھ کی مشہور نظم لوسی گرے کا ترجمہ کیا ہے اور سچ یہ ہے کہ سخن سنجی اور قادرالکلامی کی داد دی ہے۔"

عبدالحلیم شرر

یہ نظم ۱۶ر بندوں یا Stanza میں ہے۔ بدؔر کلکتوی نے بھی اسے ۱۶ بندوں ہی میں ترجمہ کیا ہے اور ان کی پوری کوشش یہ رہی ہے کہ وہ Original نظم کی روح کو پوری طرح منتقل کر دیں یہاں طوالت کے خوف سے صرف شروع اور آخر کے بند' اصل انگریزی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ ساتھ دیئے جاتے ہیں :

پہلا بند :

Oft I had heard of lucy Gray
And, When I Crosed the wild
I Chanced to see at break of day
The Solitary child.

ترجمہ :

بارہا لوسی گرے کا تذکرہ میں نے سنا
جب ہوا صحرا سے جانا میرا ہنگام سحر
پو پھٹے وقت اکثر اتفاق ایسا ہوا
لڑکی اک تنہا کھڑی آئی مجھے اس جا نظر

آخری بند :

O'er rough and smooth she trips along
And never looks behind,
And sings a solitary song.
That whistle in the wind

اک گھڑی اس عالم ہو میں بھی آرام کی
تو چلوں اب میں بھی اپنے خانۂ بے یار میں
ہر جگہ معمور ہے رب العلیٰ کے فضل سے
اور متصل اس کا بڑھا کر حوصلہ امید کا
دردمندی میں بھی پیدا کرتا ہے کچھ کچھ مزے
اور دیتا بدنصیبی میں ہے تسکیں کا مزا

پہلے بند کا پہلا Stanza "I am monarch of all I Survey" فعل معروف (Active Voice) میں ہے اور بدرؔ کلکتوی نے اس کا ترجمہ ''سلطنت اپنی ہے جتنی دور تک جائے نظر'' فعل مجہول (Passive Voice) میں کیا ہے۔ جس سے مصرع کی معنوی سطح اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور پڑھنے یا سننے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک نوع کی روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کہ تیسرے اور چوتھے مصرع کا ترجمہ اسی فعل میں کیے گئے ہیں جو اصل نظم کا ہے یعنی :

From the centre all round to the sea
I am lord of the fowl and the brute.

ترجمہ :

دامن صحرا سے دریا تک ہے جتنا بحر و بر
سب درندوں اور پرندوں کا ہوں میں فرمارو ا

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بدرؔ کو ترجمے کے فن پر بڑی قدرت حاصل تھی اور وہ اصل کی روح کو مجروح کیے بغیر مفہوم کی خوبصورت ادائیگی الفاظ میں ترمیم و اضافہ کے ذریعے کرتے ہیں۔ ترجمے کو بقول عبدالحلیم شرر ''مغربی خیالات کو ہندستانی کپڑے پہنانے'' کا گر جانتے ہیں۔

انہوں نے ورڈس ورتھ کی نظم ''لوسی گرے'' (Lucy Gray) جس کا ایک نام Solitude بھی ہے' کا اردو ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجم بھی رسالہ ''دنگداز'' میں عبدالحلیم شرر کے ذیل کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

Bether dwell in the midst of alarms,

Than reign in this horrible place.

ترجمہ :

سلطنت اپنی ہے جتنی دور تک جائے نظر
برسر پرخاش کوئی مجھ سے ہو یاں تاب کیا
دامن صحرا سے دریا تک ہے جتنا بحر و بر
سب درندوں اور پرندوں کا ہوں میں فرماں روا

کنج تنہائی! کرشمے حسن کے وہ کیا ہوئے
جن کے جلوے دیکھتے راہب تھے ترے چہرے پر
یاں تو اس وحشت کدے کی بادشاہی سے مجھے
منزل خوف و خطر میں رہنا ہے مرغوب تر

آخری بند :

But the sea-fowl is gone to her nest.

The beast is laid down in his lair,

Ev'n here is a season of rest,

And I to my cabin repair.

There is mercy ,in every place

And mercy,encouraging thought.

Gives even affliction a grace

And reconciles man to his lot.

ترجمہ :

لو وہ مرغابی نے اپنے آشیاں کی راہ لی
پڑ رہے وحشی درندے جا کے اپنے غار میں

کلکتوی کے ترجمے کے سلسلے میں درج ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

"... ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ کلکتہ کے روشن خیال نوجوان بدرالزماں صاحب نے ان مغربی خیالات کو جو ہندوستانی کپڑے پہنائے ہیں وہ کیسے ہیں، جہاں تک ہمارا خیال ہے، ہمارے دوست کو پوری کامیابی ہوئی ہے اور جیسا اچھا اور فصیح و معنی خیز ترجمہ انہوں نے کیا، اس سے بہتر اردو ترجمہ شاید مشکل سے ہو سکے گا۔ بجائے اس کے کہ اس ترجمہ کی نسبت کسی قسم کے خیالات ظاہر کی جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بجنسہ شائع کر کے ہم سخن، سخنان اردو سے دادخواہ ہوں"

مذکورہ اقتباس میں عبدالحلیم شرر نے جس توصیفی انداز سے ان کے ترجمہ پر خیال ظاہر کیا ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کو ذاتی طور ترجمہ کافی پسند آیا تھا۔ آیئے ہم بھی دیکھتے چلیں کہ ان کی پسند کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔

اصل انگریزی نظم ۷/بندوں اور ہر بند ۸/سطروں پر مشتمل ہے یعنی پوری نظم میں ۵۶/لائن (مصرعے) ہیں، بدر کلکتوی نے بھی اپنے ترجمہ کو ۵۶/مصرعوں ہی تک محدود رکھا ہے۔ البتہ اصل نظم میں ایک بند ۸/لائن یا مصرعہ پہ مشتمل ہے جب کہ بدر کلکتوی نے چار ۴/مصرعوں کا ایک بند بنایا ہے۔ اس طرح انہوں نے اصل نظم کے ۷/(سات) بندوں کی جگہ ۱۴/بند کر دیئے لیکن مصرعوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا۔ اصل نظم کا پہلا بند یوں ہے :

پہلا بند :

I am monarch of all I Survey.
My right there is none to dispute,
From the Centre all round to the Sea.
I am lord of the fowl and the brute.
Oh, Solitude where are the charms
That sages have seen in thy face?

ایسا راستہ تھا' جہاں دور دور تک پذیرائی کی چھاؤں تو دور کی بات' مشکلات کے روڑے اور دشنام طرازی کے پتھروں کے امکانات زیادہ تھے اور ہوا بھی یہی کہ آج تک بنگال کے شعری ادب کی تاریخ میں انہیں خاطر خواہ جگہ نہیں مل سکی۔ اس کے باوجود انہوں نے دو مجموعے ''لمعاتِ بدر'' (۱۹۱۲ء) اور ''ضیائے بدر'' (۱۹۱۴ء) ترتیب دیئے جن میں زیادہ تر نظمیں ہیں۔ چونکہ ہمارا موضوع ان کے منظوم تراجم سے بحث کرنا ہے' اس لیے ان کی طبع زاد نظموں سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔

جہاں تک انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کا تعلق ہے' بدرؔ کلکتوی نے اس فن کو بھی ایک خاص سلیقہ بخشا ہے۔ ویسے اردو میں ترجموں کی روایت بہت پرانی ہے۔ جب اردو زبان اپنی ابتدائی شکل میں تھی اس وقت اس کے دامن کو مالا مال کرنے کے لیے ترجموں کا ہی سہارا لینا پڑا تھا۔ البتہ اس وقت ہندستان گیر پیمانے پر جانی پہچانی' علمی و ادبی زبان فارسی تھی اور چونکہ اس زبان کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اس لیے شروع شروع فارسی کے ہی علمی و ادبی سرمائے کو اردو میں منتقل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ (بیشتیں تو ساری کی ساری پہلے ہی اپنائی جا چکی تھیں) لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری مقامی اور غیر ملکی زبانوں سے بھی ترجمے کیے گیے اور چونکہ اُنیسویں صدی کی آخری دہائی تک پہنچتے پہنچتے انگریزی حکومت اور انگریزی زبان دونوں اپنا قدم مضبوطی سے اس سرزمین میں جما چکی تھیں اس لیے اردو کے ادباء و شعرا کا ایک مخصوص طبقہ اس زبان کے ادبی سرمایہ کو اردو میں منتقل کرنے اور زبان کے فکری و صنفی اثرات قبول کرنے لگا۔ بدرؔ کلکتوی کا تعلق کا بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لہٰذا انہوں نے انگریزی زبان کے مختلف شعرأ کی ۱۱ر (گیارہ) نظموں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس سے قبل کہ ان نظموں میں سے کچھ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے بہتر ہوگا کہ ''دلگداز'' کے مدیر عبدالحلیم شررؔ لکھنوی کی آرا جو انہوں نے بدر کلکتوی کے تراجم کو شائع کرتے وقت دیئے تھے' نقل کر دی جائیں۔

Willian Cowper کی نظم Alexander Srlkirk کا ترجمہ جو بدر کلکتوی نے ''اسیر غربت'' کے عنوان سے کیا تھا اور جو ''دلگداز'' جلد ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۶ء ۱۱۔۱۰ میں شائع ہوا تھا اور جس پر عبدالحلیم شررؔ کا ایک طویل نوٹ شامل ہے جس میں انگریزی نظم سے متعلق تفصیل بتاتے ہوئے بدر

پروفیسر یوسف تقی
شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی

بدر کلکتوی - بہ حیثیت مترجم

(انگریزی نظموں کے ترجمے کے حوالے سے)

بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں دو اہم شعرا (وحشت کلکتوی اور بدر کلکتوی) بنگال کی نمائندگی اُردو دنیا میں کر رہے تھے۔ دونوں ہی شمس کلکتوی کے شاگرد تھے۔ چونکہ اس دور میں غزلیہ شاعری کا زور زیادہ تھا، اس لیے ان شعرا کی پذیرائی زیادہ ہوئی جو غزل کے ہو کر رہ گئے تھے اور جنہوں نے آزاد اور حالی کی نظمیہ شاعری سے خود کو محفوظ رکھنے کی ہر طرح سے جتن کیے۔ لیکن اس دور میں چند شعرا ایسے بھی تھے، جنہوں نے نظمیہ شاعری کی اس تحریک یا رجحان کو لبیک کہا تھا اور اپنی پوری شعری صلاحیت نظمیہ شاعری کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ صورتِ حال پوری اردو دنیا کی تھی، پھر بنگال کے اردو شعرا اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ اس وقت یہاں کی غزلیہ شاعری کے علم بردار حضرت وحشت کلکتوی تھے جب کہ نظمیہ شاعری کی نمائندگی بدر کلکتوی کر رہے تھے۔ چونکہ غزلیہ شاعری عوامی سطح پر زیادہ مقبول تھی، اس لیے وحشت کلکتوی کی بہت زیادہ پذیرائی ہوئی اور بدر کلکتوی کی بدنصیبی یہ تھی کہ انہوں نے اجتہادانہ اور باغیانہ راستے کو اپنایا تھا اور یہ ایک

ہائے وہ لمحہ کہ تجھ کو دیکھنے کی آرزو
دل مگر اس آرزو پہ آج پچھتایا بہت

جب ان کا ذکر کسی محفل میں چھڑ جاتا ہے، دل ستم زدہ کو تھام تھام لینے کا خیال پیدا ہوتا ہے :

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ظفر اوگانوی نے تحقیق وتنقید کے میدان میں اچھی شہ سواری کا ثبوت دیا۔ ان میں آرزوئے فن کی وہ تجلّیاں پوشیدہ تھیں جو جہانِ معنی کو تابنا کی عطا کرتی ہیں۔ اگر ان کے ادب پاروں کا محاسبہ تنقیدی بصیرت کی میزان پر کیا جائے اور خیال خاطرِ احباب سے بے نیاز ہو کر عدل سے کام لیا جائے تو فضل کی تابنا کی اپنا چہرہ دکھائے گی۔ ظفر اوگانوی کے افکار کا سینہ جوہر آب دار سے مرصع ہے جس کی تہہ میں بے شمار خیالات موجیں مار رہی ہیں۔

فطرت ایک فن کار کو زمانہ شناسی سے آشنا کرتی ہے تو اس کی نبض پر ہاتھ رکھنے کی بصیرت عطا کرتی ہے اور وہ بادِ سموم کو چیر کر ایسی کھلی جگہ پر آجاتا ہے، جہاں اس کی مشعلِ فکر طوفان کا مقابلہ کر کے زیادہ روشن ہوتی ہے اور گمشدہ منزل کی تلاش کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ تلاش ظفر اوگانوی کی تخلیقات کی ورق گردانی اور غور وفکر کرنے میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے زندگی کا مطالعہ وسعتِ نظر کے ساتھ کیا تھا اور مایوسی کو راہ نہیں دیا تھا۔ تگاپوئے دمادم سے گریز نہیں کیا تھا۔ مسائلِ حیات ان کی تخلیقات میں پوری طرح سموئے ہوئے ہیں اور شب کو سحر کرنے کا جلوہ ملتا ہے۔

ظفر اوگانوی ایک نطق گویائی کا نام ہے جو احساسِ بشر سے مملو ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں دل سوزاں کے جاگنے کا وہ ساز ہے جو افکارِ تازہ سے مزین ہے۔ ان کے تخئیل کے اعراب میں کون ومکاں کے وہ نکتے پوشیدہ ہیں جو پھیل کر زمانہ بنتے ہیں۔ ان کے افکار کی فضا، ان کے نوکِ قلم کی پرواز سے گونج رہی ہے۔ یہ فضا معطر ہے، اعجازِ رقم سے، جسے حسنِ نو بخشا گیا ہے۔ ان کے خیالات کے پھولوں کا تبسم سازِ ہستی سے لبریز ہے جو ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہے، جہاں زیست سے بے گانگی نہیں ہے بلکہ حسنِ نو کی تازگی ہے۔

☆☆☆☆

ہے۔اس موقع سے ایک یادگار مشاعرہ ہوا تھا جس میں نام ور شاعروں نے شرکت کی تھی۔

اس شعبہ کی ترقی اور شہرت کی دوسری صورت یہ ہے کہ فیض احمد فیضؔ کا نام اُردو شعبہ کے اُستاد کی حیثیت سے منتخب ہوا تھا۔ بایاں محاذ کی سرکار نے منظوری دے دی تھی لیکن پیری کی وجہ سے اور دوسری مجبوری کی بنا پر شعبہ سے منسلک نہیں ہو سکے۔ اگر وہ شریکِ شعبہ ہوتے تو خاکسار کو فخر کے ساتھ یہ کہنے کا موقعہ ملتا کہ میں نے بھی فیضؔ کی صحبت میں کچھ سیکھا ہے۔ خیر اس کا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ فیضؔ کے انتخاب میں ظفر اوگانوی صاحب نے راہیں ہم وار کیں اور یونی ورسٹی کے حکام کو ہمنوا بنایا۔ بعد ازاں کالج سروِس کمیشن کے ممبر اور مائناریٹی کمیشن کے چیئرمین مقرر ہوئے اس زمانے میں ایم-اے کے کلاس لیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں کینسر جیسا موذی مرض ستانے لگا۔ شروع میں اندازہ نہیں ہوا لیکن بعد میں تکلیف بڑھنے لگی۔ علاج میں کوتاہی نہیں برتی گئی۔ کئی اسپتالوں اور نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے مگر اس مرض سے چھٹکارا نہیں ملا۔ بالآخر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

ظفر اوگانوی کی شخصیت تہہ دار تھی۔ ان کے مزاج میں نرمی اور خاکساری تھی۔ انہوں نے مصلحت سے مصالحت نہیں کی۔ ان کی علمی صلاحیت کو جلا بخشنے میں علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی اور سیّد نجیف اشرف نے اہم رول ادا کیا۔ علامہ جمیل مظہری کے ماتحت تحقیق کا کام انجام دیا اور تا عمر علامہ کی قدر کرتے رہے۔

ظفر اوگانوی اپنے شاگردوں اور رفیقوں کے درمیان بے انتہا پاپولر تھے۔ جو بھی ایک بار ملتا، ان کے اخلاق اور خاکساری کا قائل ہو جاتا۔ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مدد کرنے میں بخالت سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ اپنے حریفوں کے درمیان یاد کیے جاتے رہے، اپنے تغزل کی زبان کی وجہ سے، راست گوئی کی بنا پر اور شرافت کے لیے۔ ظفر اوگانوی ایک ہمدرد انسان کا نام ہے۔ اچھے اور باصلاحیت اُستاد کا رتبہ حاصل کیا ہے۔ انہوں نے نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو سے ناتا جوڑا تھا۔ دوسروں کی ترقی سے خوش ہوتے تھے اور بسا اوقات اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مدد کرتے تھے۔ آج بھی ایسے استاد کی صحبت سے فیض ہونے کا خیال موجیں مارتا ہے :

سرفراز ہوا۔ اس گراں قدر مقالے پر پٹنہ یونی ورسٹی نے ڈاکٹریت کی ڈگری تفویض کی۔ کلکتہ میں اس کی اشاعت ہوئی اور گرانڈ ہوٹل کے بیس منٹ ہال میں رسمِ اجرا ادا کی گئی۔ شہر کے بیش تر ادب نوازوں نے شرکت کی تھی۔ میرے کہنے کا ہرگز مطلب نہیں کہ ظفر اوگانوی کے اس کارنامہ کو اس تقریب کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ رسمِ اجرا کی چکا چوندھ روشنی تجزیاتی راہ کو ظاہر نہیں کرتی، تنقید کے دروازے وا نہیں کرتی۔ تقریروں کی گرمی اوراق کھولنے کا سبب نہیں بنتی۔ ظفر اوگانوی کی اس کتاب کی ورق گردانی ڈوب کر اثر لینے اور ان کے تجزیاتی عمل پر اُکساتی ہے۔ اس مقالے کی اشاعت کے بعد بہتر ے ناقدوں نے اپنی گراں قدر رائے سے نوازا اور بیک زبان ہو کر تعریف کی۔ خاکسار کو ان کا طالب علم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ کلکتہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ ۶۷ء دسمبر کی بات ہے۔ اس زمانے تک یہ شعبہ بنگلہ زبان کے شعبہ سے منسلک تھا۔ اشیت کرشنا بنرجی بنگلہ ڈیپارٹمنٹ کے صدر تھے۔ انہوں نے ظفر اوگانوی صاحب سے کہا کہ اُردو کل ہند زبان ہے اور اس کے بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کروڑوں کی ہے، اس لیے کلکتہ یونی ورسٹی میں مکمل شعبہ ہونا چاہیے۔ ٹیچرز یونین کے فعال لوگوں کے اشتراک سے سنڈیکیٹ اور سینٹ کی رائے ہم وار کی گئی۔ اس کام کی انجام دہی میں اس زمانے کے اساتذۂ اُردو نے مدد کی۔ خاکسار بہ حیثیت لیکچرر کام کر رہا تھا اور ظفر اوگانوی کا ساتھ دے رہا تھا۔ دونوں ایوانوں کی منظوری اور حکومتِ مغربی بنگال کی رضامندی سے اُردو کا شعبۂ قائم ہوا جس کے صدر ظفر اوگانوی صاحب مقرر ہوئے اور بحسن وخوبی شعبہ کی ترقی کے منصوبے بناتے رہے اور کامیاب کرتے رہے۔ اس کی ترقی میں اس وقت کے تمامی اساتذہ نے مدد کی۔ اس کے بعد اقبال صدی کی تقریبات بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منائی گئیں۔ تین روزہ جشن میں سیمینار، مشاعرہ اور سنگیت کا پروگرام ہوا۔ سیمینار میں ہندستان گیر سطح کے نام ور اہلِ قلم نے مقالے پڑھے اور اپنے کلام سے محفلِ مشاعرہ کی رونق بڑھائی۔ یہ سارے مقالے ''رموزِ اقبال'' میں منضبط ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب ظفر اوگانوی مرحوم نے دی تھی۔ یہ کتاب اقبالیات کا ایک اَنوٹ حصہ ہے۔ اقبال کے افکار ونظریات سے متعلق اس قبیل کا سیمینار نایاب نہیں تو کمیاب ضرور

تھے۔ اگرچہ پوری طرح حافظِ قرآن نہیں ہو سکے کہ انہیں مدرسہ شمس الہدیٰ (پٹنہ) جوائن کرنا پڑا' جہاں سے دینی و دنیاوی دونوں انداز کی تعلیم حاصل کی۔ پٹنہ یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم-اے اور پی ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پٹنہ یونی ورسٹی کا ماحول ان کے ذہن کی آبیاری میں معاون ثابت ہوا۔ یہاں کی خارجی اور داخلی فضا نے تازیانے کا کام کیا اور وہ رفتہ رفتہ ادب کی طرف مائل ہوئے۔ ابتداً میں اساتذۂ فن کا مطالعہ کیا اور اپنی تخلیقی فعالیت کو ایک سمت عطا کی۔ یہ سطح تھی، جدیدیت کی۔ جدیدیت کے اماموں میں شمس الرحمٰن فاروقی تھے جس سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار شمس الرحمٰن فاروقی کلکتہ آئے تھے۔ ظفر اوگانوی صاحب سے ملاقات کی تھی۔ سالک لکھنوی کے دولت کدہ پر نشست ہوئی تھی۔ یہاں ادب کے مختلف گوشوں پر کھل کر گفتگو ہوئی تھی۔ ظفر اوگانوی صاحب' شمس الرحمٰن فاروقی کی علمی صلاحیت سے متاثر تھے لیکن مقلد نہیں تھے۔ تقلید ان کا شیوہ نہیں تھا۔ ادب کی شاہ راہ ان کی اپنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس راہ پر گامزن تھے' وہ راہ ان کی فکر سے مزین تھی۔ اس فکر پر تنقید کی جا سکتی ہے اور جس قدر مختلف خیالات کے دروازے کھلیں گے' اسی قدر اس کا مرتبہ بلند ہوگا۔ خیال یا فکر کو ایک اِسٹائل عطا کرنا شخصیت کی پرکھ کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ صنف میں یکسانیت ہو سکتی ہے لیکن اسلوب جداگانہ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے جو شناخت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کی شناخت میں ان کا منفرد لب و لہجہ' طرفگی ادا۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کا درک اور دیدہ وری کا ملکہ اس تیور کے ساتھ نمایاں ہیں' جیسے دن کی روشنی میں کوئی شئے پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔

''پیچ کا ورق'' ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے جس میں بیش تر افسانے عصری کیفیات و حالات کی عقدہ کشائی میں معاونت کرتے ہیں۔ یہاں پُر پیچ حالات کی جلوہ نمائی بھی ہے اور بے چہرگی کے نقوش بھی۔ یخ بستہ ہاتھوں کا تپاک بھی ہے اور زرگری کی کسمساہٹیں بھی۔ تصنع و تکلف کا شائبہ بھی ہے اور بے یقینی و بے جہتی کی تصویر بھی۔ بیانیہ انداز علامت نگاری سے خلط ملط ہو کر ایک عجیب جلوہ پیدا کرتا ہے۔

ان کا تحقیقی مقالہ ''صفیر بلگرامی-حیات و خدمات'' ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پر آ کر قبولیت سے

پروفیسر عبدالمنان
شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی

ظفر یابی

اُردو ادب میں ظفر اوگانوی ایک معتبر نام ان معنوں میں ہے کہ انہوں نے کئی جہتوں سے شعر و ادب کے پودے کی آبیاری کی۔ تنقید تحقیق اور افسانہ نگاری میں جو مقام پیدا کیا' انہیں شہرت کی میزان پر تولا نہیں جا سکتا بلکہ سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ سنجیدگی اور دیانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے افکار کی مختلف جہتوں کی ورق گردانی کی جائے جس کی تہوں تک جانے کے لیے ان کے ماحول کی عقدہ کشائی ناگزیر ہے، جہاں ان کی پرورش ہوئی تھی اور خارجی حالات و کوائف سے بلند و بالا اثر دید کے نتیجے میں دریافت کا ایسا نکتہ سامنے آیا تھا جس کی روشنی میں ان کے تمام تر افکار کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ظفر اوگانوی کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد مولانا فصیح الدین احمد صاحب ایک جید عالمِ دین اور صاحبِ باطن بزرگ تھے۔ دین داری اور خدا ترسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ فقر و غنا شیوۂ خاص تھا۔ ٹونک (راجستھان) کے ایک دینی مدرسہ میں درسِ قرآن پاک دیا کرتے تھے۔ احادیث اور حکایات سے آشنا تھے۔ ظفر اوگانوی کی ابتدائی تعلیم اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ ابتدا میں مذہبی کتابوں کے علاوہ حفظ قرآن کی طرف مائل

شعبے کی کچھ کمزوریاں بھی ہیں جنہیں ہم دور کرنا چاہتے ہیں، مثلاً برسوں سے شعبے میں کوئی سیمینار یا سمپوزیم کے انعقاد کی نوبت نہیں آئی۔ ہر سال پی ایچ-ڈی میں نئے داخلے ہو رہے ہیں اور ریسرچ اِسکالروں کی اچھی خاصی تعداد ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز کی جا رہی ہے۔ اُردو ادب کا منظر نامہ تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے ہم ادبی مسائل پر سنجیدگی سے باہمی گفتگو اور تبادلۂ خیال کریں اور ایسا صرف قومی اور بین الاقوامی مذاکروں کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس جذبے کے پیش نظر شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی اپنے محدود ذرائع کے باوجود شعبے میں مختلف موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم اور ورک شاپ کروانے کے حق میں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایم-اے کے نصاب کو یو-جی-سی کے معیار کے مطابق ترتیب دینے کا کام بھی زیرِ غور ہے۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے گروپ پیپرز کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ ایم فل کی بھی کوئی صورت نہیں نکل پا رہی ہے۔ کوئی علیحدہ کمرہ نہ ہونے کی وجہ سے Xth پلان کے تحت ملنے والی اس رقم کو جو Equipment خریدنے کے لیے ملی تھی، اجتماعی فنڈ میں ڈال دیا گیا ہے اور دوسرے چھوٹے شعبوں کے ساتھ مل کر اس کمپیوٹر روم کے قیام کی تیاری میں ہاتھ بٹایا گیا ہے، جسے پوری طرح لیس کرنے کے بعد استعمال کے لیے کھولا جائے گا اور جہاں اُردو کا بھی برابر کا حق ہوگا۔

''دستاویز'' کا یہ شمارہ کافی عجلت میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ تاہم اساتذہ حضرات وطلباء طالبات نے بھرپور تعاون کیا ہے۔ اس شمارے کی اشاعت کے سلسلے میں پروفیسر سُورنجن داس (پرووائس چانسلر، اکیڈمک)، پروفیسر ٹی-کے-مکھرجی (پرووائس چانسلر، فنانس)، پروفیسر اُجل باسو (رجسٹرار)، ڈاکٹر دُھرجیوتی پرساد دے (سکریٹری، آرٹس اور کامرس) کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔

شہناز نبی

صدر، شعبۂ اُردو

کلکتہ یونی ورسٹی

☆☆☆☆☆

پیش لفظ

مدتوں بعد ''دستاویز'' کی تجدید ہو رہی ہے۔ شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی کا یہ مجلّہ محترم و معظم استاد مرحوم پروفیسر ظفر اوگانوی کی زیرِ ادارت شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد شعبۂ اُردو کی کارگزاریوں اور علمی و ادبی کاوشوں کا احاطہ کرنا تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ پچھلے بیس برسوں میں شعبۂ اُردو تعطل کا شکار رہا ہے یا پھر یہ کہ علمی و ادبی سرگرمیوں کا کوئی سلسلہ باقی نہ رہا تھا۔ ان برسوں میں شعبے میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ اساتذہ حضرات مختلف علمی و ادبی کاموں سے جُڑے رہے اور گراں قدر تحقیقی تصنیفات منظرِ عام پر آئیں۔ ایم۔اے اُردو کے طلبا و طالبات کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور حالت یہ ہوئی کہ کلاس روم مختصر ثابت ہونے لگے۔ حالاں کہ نو تعمیر عمارت میں شعبے کی منتقلی کی بات بھی چلی اور کشادہ کمروں کے تصور نے متزلزل بھی کیا' تاہم آسوتوش بلڈنگ کی قدامت اور اس سے اک طرح کی اُنسیت ہمارے پاؤں جکڑے رہی۔ اب یہ عالم ہے کہ اربابِ حل و عقد کی کشادہ دِلی کے باوجود ہم انہی دو کمروں میں سمٹے ہوئے ہیں اور کسی طرح کام چلا رہے ہیں۔

یکم اپریل ۲۰۰۳ء سے شعبے کی صدارت مجھے سونپی گئی۔ اس دوران ایم۔اے سالِ اوّل و دوم کے امتحانات مقررہ وقت پر ہوئے اور نتائج کا اعلان بھی بلا کسی تاخیر کے ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اساتذہ کی پُرخلوص محنت اور تعاون سے یہ کام بحسن و خوبی انجام پا سکا۔ دیوار گیر مجلّہ بھی حسبِ روایت منظرِ عام پر آ رہا ہے اور طلبا و طالبات کی تخلیقی کاوشوں کا بہترین ترجمان ثابت ہو رہا ہے۔ بہت جلد شعبۂ اُردو سے فارغ التحصیل طلبا و طالبات کی ایک انجمن بنائی جائے گی تاکہ سال میں ایک بار ہی سہی لیکن ہم سب مل بیٹھیں اور ٹوٹی کڑیوں کو جوڑنے کی سعی کریں' بنگال میں اُردو کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اسکے فروغ و بقا کے لیے مناسب اقدامات کریں۔

ترتیب

ڈاکٹر شہناز نبی	پیش لفظ	5
پروفیسر عبدالمنان	ظفریابی	7
پروفیسر یوسف تقی	بدر کلکتوی - بحیثیت مترجم	12
ڈاکٹر شمیم انور	۵۵ رکیلوں پر ٹنگا ہوا آدمی (نظم)	19
حیدر صفت	غزالاں تم تو واقف ہو (نظم)	21
ڈاکٹر شہناز نبی	فیمینزم - جرمنی میں	23
ندیم احمد	جدید تنقید	54
الماس شیخ	شیکسپیئر کے شاہکار ڈراموں کے اُردو ترجمے	61
شعبۂ اُردو کی سرگرمیاں		71
وظائف		72
استقبالیہ والوداعیہ جلسہ کی رپورٹ		74
تصاویر		75
ون ڈے ٹور		76
دیوار گیر مجلّہ		77
تصاویر		78

☆☆☆☆

انتساب

معزز و محترم اُستاد

پروفیسر ظفر اُوگانوی کے نام

اشاعت : فروری ۲۰۰۴ء

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : تسلیم عارف-طلحہ گرافکس

22/H/11، لنٹن اسٹریٹ، کلکتہ-۱۴، موبائل: 9830126311

ناشر : پروفیسر اُجل باسو، رجسٹرار، کلکتہ یونی ورسٹی

۱/۸۷، کالج اسٹریٹ، سینیٹ ہاؤس، کولکاتا-۷۰۰۰۷۳

سرورق کی تصویر : محمد اقبال خان

طباعت : نکہت پرنٹنگ و پیکیجنگ، توپسیا، کولکاتا

قیمت : ۳۵/روپے

☆☆☆☆☆

G165781

دستاویز

CALCUTTA UNIVERSITY
CENTRAL LIBRARY

۲۰۰۳-۰۴ء

مجلّہ-۱

شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی کا تحقیقی اور ادبی سالانہ مجلّہ

چیئرمین
پروفیسر سُورنجن داس
پرو-وائس چانسلر (اکیڈمک)

ایڈیٹر
ڈاکٹر شہناز نبی
صدر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی

ادارۂ تحریر
پروفیسر عبدالمنان، پروفیسر یوسف تقی
ڈاکٹر شمیم انور، جناب غلام حیدر صفت

دستاویز

۲۰۰۳-۰۴ء

شعبۂ اُردو، کلکتہ یونی ورسٹی